منشور

لہو کی پکار

محصور ہو گئے ہیں عجب فصلِ گل میں ہم
کلیوں کے دل فگار ہیں، پھولوں کے دل قلم

اِک پل میں ہم پہ ایک صدی سی گذر گئی
لمحوں سے ناپتے رہے احباب طولِ غم

اب حسنِ قدس کس سے کرے منتِ ردا
اہلِ حرم نے چاک کیا پردۂ حرم

تاروں کا قتل پردۂ شب میں ہوا اگر
دستِ سحر سے خون تو ٹپکے گا صبح دم

چپ چاپ پی گئے ہیں لہو کی پکار کو
دانشوری کے یوں تو بڑے مدعی ہیں ہم

احمد ندیم قاسمی

حیات و کائنات کا ترجمان

منشور

جلد - ۲ جنوری ۱۹۶۵ء شمارہ ۳

مدیر

سبطِ اختر

قیمت فی پرچہ

پچیس پیسے

سال بھر کے لئے

تین روپے

ناشر

سبط اختر

مطبع

مشہور پریس میکلوڈ روڈ کراچی

پتہ

ماہنامہ منشور - ایروپیز ایمپلائز یونین
پی آئی اے برانچ - کراچی ایرپورٹ
فون نمبر ۴۹۱۶۹

اس منشور میں

مزدوروں کے بین الاقوامی دن کے موقعہ پر

ماھنامہ **منشور** کراچی

یکم مئی سنہ ۱۹۶۵ء کو

یومِ مئی نمبر

پیش کرے گا

مزدور دوست اور قلم کار حضرات اس تاریخی واقعہ سے متعلق اپنی تخلیقات
جلد از جلد روانہ فرمائیں

منشور کا یوم مئی نمبر محنت کشوں کی تنظیم اور انکی بے مثال جدوجہد کی ایک تاریخی دستاویز ہوگا۔

ماھنامہ منشور۔ کراچی ایرپورٹ فون:۔ ۴۹۱۶۹

یکم مارچ کے شہیدوں تم پر لاکھوں سلام



آج یکم مارچ ہے۔

سنہ ۶۳ء میں آج ہی کے دن، کراچی کے مزدوروں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ بات وہ ہی پرانی تھی، جو انسان دوستوں اور انسان دشمنوں کی ایک زمانے سے تخصیص کرتی آئی ہے۔

حقدار، اپنا حق چھیننے والوں کے خلاف، مجبور ہو کر، تنگ ہو کر میدان میں جمع ہوتے ہیں اور حق داروں کو حق نہ دینے والے انکی جرأت رندانہ سے گھبرا کر تشدد کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

یہ ہی کراچی میں بھی ہوا تھا، مزدور اپنی روزمرہ کی مشکلات سے بیزار ہو گئے تھے۔ روٹی، روزگار، اور مکان کے مسائل نے ان کے پیٹ اور ذہن کو ناقابل تحریر کرب و اذیت میں گرفتار کر ڈالا تھا۔ مل مالکوں کی فرعونی ذہنیت انھیں پاؤں تلے روندنے پر بضد تھی، حالات کار کی ابتری، اور شرائط ملازمت کی سختی نے انھیں "صنعتی غلام" بنا کر رکھ دیا تھا۔ یہ تھے وہ روح فرسا حالات، جن کو ختم کرنا تو خیر دور کی بات ٹھہری، صرف تھوڑا بہت بدلنے کے لئے ہی انھوں نے متحدہ قدم اٹھایا تھا۔ کہ انھیں گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں جب بھی ظلم کے خلاف آواز اٹھتی ہے، گولیاں سنسنانے لگتی ہیں، جب بھی ننگے بھوکے محنت کشوں کا لشکر اپنے حقوق مانگنے نکلتا ہے، لاٹھیاں برسنے لگتی ہیں، جب بھی حقوق یافتہ طبقے کے ایوانوں کی دیواریں لرزتی ہیں، ان ایوانوں کے تنخواہ دار محافظ، تلواریں سونت کر نہتے اور حقوق سے محروم عوام پر ٹوٹ پڑتے ہیں یہ صدیوں سے ہوتا آرہا ہے۔ یکم مئی کو امریکی شہر شکاگو میں یہ ہی ہوا — ۹ مارچ کو ٹول پڈل کے قصبے میں چھ جانبازوں کو جلاوطن کرنے کے بعد یہ ہی ہوا — اور یکم مارچ کو کراچی میں بھی یہ ہی ہوا۔ خون بہا لاشیں گریں اور اس بے حس خاک نے بے گور و کفن شہیدوں کو اپنے قبر نما، ہولناک جبڑوں سے نگل ڈالا — چباڈالا اور لیڈروں کے لئے امن برقرار رکھنے والے محافظوں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ محنت کشوں میں ابھرتے ہوئے شعور کو دبانے میں کامیاب ہو گئے ہیں، مزدوروں کے عزائم پست ہو گئے ہیں، انکی تنظیم بکھر گئی ہے۔ اب خون مزدور سے تعمیر ہونے والی فصیلوں کو کوئی خطرہ نہیں۔ اب کبھی کوئی اپنا جائز حق مانگنے اور غاصب کو للکارنے کے لئے نہیں بڑھے گا۔ مگر انکی یہ خوش فہمی کتنی عارضی تھی۔ انھوں نے تھوڑے ہی عرصے کے بعد دیکھ لیا کہ لاٹھیوں نے چند کھوپڑیاں تو پھوڑی تھیں، مگر بے شمار کھوپڑیوں میں وہ ہی جنون سما گیا تھا، چند گردنیں قلم ہوئی تھیں مگر نئے جیالوں نے سینہ تان لیا ہے، قید و بند، جسم و تن کا مقدر و نصیب تو بنا تھا۔ مگر آزادی فکر کا عقاب بلند فضاؤں میں محو پرواز ہو گیا ہے، مزدور کارکن تو بے روزگار ہوئے تھے مگر نئے بھرتی ہونے والے مزدور کے لئے بھی ٹریڈ یونین کا رکن بننے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ مزدور یونینوں کے دفتر تو مقفل کئے گئے تھے مگر اب گلی گلی اور کوچے کوچے میں تنظیمی مسائل کو حل کیا جا رہا ہے — اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد کراچی کے ساتھ ہی ساتھ پورے ملک میں ایک بار پھر محنت کشوں کے پاٹ دار نعرے گونجنے لگے ہیں، پھر جتھے بننے لگے ہیں۔ پھر وفود جانے لگے ہیں پھر اخباروں میں ان کے مسئلے چھپنے لگے ہیں، پھر قافلے میدانوں کی طرف بڑھنے لگے ہیں — اور یہ قافلے، یہ لشکر میدانوں کی طرف بڑھتے ہی رہیں گے، اس وقت تک جب تک کہ بھوکوں کے پیٹ سیسے کی گولیوں سے بھرنے کی پالیسی ترک نہیں کی جاتی، جب تک کہ جبر و اختیار کی خو نہیں چھوڑی جاتی، جب تک کہ "سرمایہ" کے مقابلے میں "محنت" کی تذلیل کرنے کی بجائے عزت کرنے کی حکمت عملی نہیں اپنائی جاتی۔ اگر یہ سب کچھ نہیں ہوگا تو صنعتی امن تہہ و بالا ہوتا رہے گا، ملک پسماندہ رہے گا، پنج سالہ منصوبہ دھرا رہ جائے گا — امیر اور امیر بنتا رہے گا، غریب اور غریب کیا جاتا رہے گا — اور معاشرہ آہستہ آہستہ واضح طور پر دو طبقوں میں تقسیم ہو کر رہے گا۔

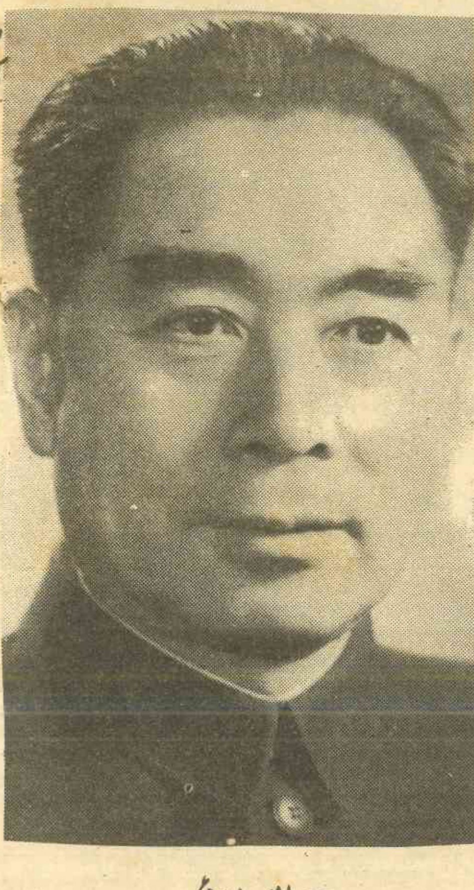
اگر اب بھی ناسمجھی سے کام لے کر یا شعوری طور پر مسائل کو حل نہیں کیا گیا تو یہ بات یقینی اور قطعی ہے کہ وہ آتش فشاں، جو سینوں میں چھپا ہوا ہے، ایک روز ایک دن پھٹ پڑے گا۔ دیر سویر کی بات نہیں مگر یہ ہونی شدنی ہے کہ اگر مزدوروں کو، سرمایہ داروں کے مقابلے میں افضلیت اور اہمیت و توجہ نہیں دی گئی تو طبقاتی کشمکش کے تند و تیز سیلاب، میں قومی سرمایہ داری اور بین الاقوامی سامراجیت خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گے، ملکی حدود میں ممکن ہے کہ ابھی جمی ہوئی برف زیادہ تیزی سے نہ پگھل رہی ہو مگر بین الاقوامی پیمانے پر دن بدن ہونے والی تیز تر تبدیلیاں کہہ رہی ہیں کہ حق و صداقت کے اصولوں کیلئے جان دینے والے شہیدوں کا خون رنگ لا کر رہے گا، افراد کی شاہی چند روز ہو تو ہو، مگر جمہور کی سالاری کا وقت آ گیا ہے۔ وقت کے بدلتے ہوئے تیور صاف بتا رہے ہیں کہ ذہنوں میں ابھرتے والے سورج پر کمندیں نہیں ڈالی جا سکتیں — !!

صحرا بہ صحرا
کو بہ کو

مارکو پولو

پاکستان

چین سے اقتصادی معاہدہ



چواین لائی

عوامی جمہوریہ چین نے پاکستان کو جو ساٹھ ملین ڈالر قرضے کی پیشکش کی ہے۔ اسکو حکومت پاکستان نے قبول کرلیا ہے اور پچھلے دنوں اس قرضہ کے معاہدے پر دستخط ہو گئے ہیں۔

اس قرضے کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک ایسے ایشیائی ملک نے دیا ہے جو بذات خود پاکستان کی آزادی کے بعد آزاد ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے جلد از جلد معاشی میدان میں استحکام اور پائیداری حاصل کرلی

اسکی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ چین کو ابھی خود اپنی ترقی کے لئے سرمائے کی ضرورت ہے مگر اس کے باوجود اس نے پاکستان کی ضروریات کو محسوس کیا اور عملی تعاون کی پیشکش کی، پیٹ بھرا اگر کسی کو دعوت دے تو یہ بات اتنی اہم نہ ہو گی جتنی کہ کوئی بھوکا، دوسرے بھوکے کو اپنی روٹی میں سے ایک حصّہ صرف دکھاوے کے طور پر نہیں بلکہ عملاً پیش کرے

اس کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ بلا سودی قرضہ ہو گا نیز یہ قرضہ آئندہ بیس سال میں ادا کیا جا سکے گا جس میں دس سال چھوٹ کے بھی شامل ہیں۔

اس کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اسکی ادائیگی پاکستانی اشیاء کے ذریعہ ہی کی جائے گی۔ ہمارا زر مبادلہ محفوظ رہے گا۔

اس کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ساتھ بھاری بھاری تنخواہ لینے والے وہ "مشیر" نہیں بھیجے جائیں گے جو ہمارے مفادات کی بجائے قرض دینے والے ملک کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں اور قرضہ کی رقم کا ایک بڑا حصّہ خود ہی ہضم کر جاتے ہیں۔

اس کی چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ غیر مشروط طور پر دیا گیا ہے کوئی سیاسی شرط نہیں لگائی گئی بلکہ اگر دیکھا جائے تو پاکستان چین دشمن فوجی معاہدوں کا ممبر بھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود چینی رہنماؤں نے کوئی اڑنگا نہیں مارا اور رضاکارانہ انداز میں پاکستان کی عملی ہمدردی کی۔

اس کی ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ یہ پاکستان کے صنعتی منصوبوں کو پورا کرنے کے لئے مشینری وغیرہ کی شکل میں فراہم کیا جائے گا۔

اشتراکی چین کے قرضہ کی ان تمام خصوصیات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہمارا یہ عظیم ہمسایہ نہ صرف پاکستان کا قابل اعتماد ساتھی ہے بلکہ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اشتراکی چین درحقیقت پاکستان اور دوسرے ایشیائی و افریقی ممالک کی ترقی کا خواہاں ہے حکومت پاکستان نے اپنی نوعیت کے پہلے معاہدے پر دستخط کئے ہیں ورنہ ابھی تک تو جن امریکی، برطانوی اور دوسرے سرمایہ دار ملکوں کے معاہدوں پر دستخط کئے گئے ہیں

وہ ہمارے لئے اپنی بھاری شرح سود کی وجہ سے معاشی جال کی حیثیت رکھتے ہیں اگر سرمایہ دار ممالک درحقیقت پاکستان یا دوسرے ممالک کو ترقی کی راہ پر گامزن دیکھنے کے خواہش مند ہیں تو وہ بھی اشتراکی چین کی طرح بلا سودی قرضے دیں اور اسکی ادائیگی کے لئے ایسی ہی سہولیات بہم پہنچائیں۔ لیکن ان کے قرضے تو ان کی سیاسی اور تجارتی اغراض کے تحت ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد تو تعمیر و ترقی نہیں بلکہ صرف اور صرف نفع ہوتا ہے وہ جب اپنے ہموطنوں کا خون چوسنے سے باز نہیں رہتے تو بھلا ہما شما کو کہاں چھوڑیں گے۔ سرمایہ دار ـــــ لوٹنے کھسوٹنے سے نہ کبھی چوکا ہے نہ چوکے گا۔ ان کا تو نصب العین ہی یہ ہے کہ چھوٹی قوموں اور ملکوں کے وسائل اور انکی منڈیوں پر قبضہ کیا جائے اور اگر قبضہ ہے تو اسے برقرار رکھا جائے۔

اب یہ ہمارا اپنا کام ہے کہ ہم ہوش کے ناخن لیں۔ دشمنوں کو پہچانیں، دوستوں کو پہچانیں اشتراکی چین نے جس خلوص و محبت دوستی اور بھائی چارہ کا، مظاہرہ کیا وہ عملی طور پر ہمارے سامنے ہے، ہمیں بھی ان کے بڑھتے ہوئے دست تعاون کو مضبوطی سے تھامنا چاہیئے اور جذبۂ خیر سگالی اور اظہار اعتماد کے طور پر ان تمام فوجی معاہدوں کو ٹھکرا دینا چاہیئے جو بالواسطہ چین کے خلاف کیئے گئے ہیں۔ اسی میں ہمارا بھلا اسی میں ہماری بڑائی ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ ہم اپنا بھلا اور بڑائی چاہتے بھی ہیں یا نہیں۔۔!

ہندوستان

لسانی جھگڑے

ہندوستان کی صنعت وتجارت میں بڑھتے ہوئے امریکی سرمائے کی بدولت آخرکار وہاں کے رہنماؤں کو اس قدر مجبور ولاچار ہونا پڑا کہ بڑے سرمایہ داروں کی خواہش کے عین مطابق، وہ آزاد خارجہ پالیسی، پرامن حکمت عملی اور سائنسی اشتراکیت کے اصولوں سے کوسوں دور جانکلے اور بالآخر انھیں سامراجیوں سے فوجی گٹھ جوڑ کرنے میں ہی راہ فرار ملی - اور جب ہی سے بھارت جس سیاسی اور معاشی بحران میں پھنسا ہے، اس سے ابھی تک نہیں نکل پایا - بلکہ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ یہ بحران شدید سے شدید تر ہوتا جارہا ہے -!

آج کل وہ لسانی بحران میں بھی پھنسا ہوا ہے ہندوستانی آئین کے تحت ہندی اس ملک کی زبان ہے، عبوری دور کے لئے انگریزی کو بھی سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا تھا - ۲۵ جنوری ۱۹۶۵ء کو یہ عبوری دور ختم ہوا اور ۲۶ جنوری ۱۹۶۵ء سے پورے ہندوستان میں ہندی کو ہی سرکاری زبان بنانے کا اعلان کر دیا گیا ادھر یہ اعلان ہو، ادھر جنوبی ہند، مدراس اور دوسرے ہندی نہ بولنے والے علاقوں میں ہندی کے —— خلاف ایک زبردست اور ہمہ گیر تحریک شروع ہوگئی جو آہستہ آہستہ بغاوت کی حدوں تک جا پہنچی —— وہ تو کہئے کہ فوج لاکر صورتحال سنبھالنے کی کوشش کی گئی ہے مگر یہ معلوم نہیں کہ ایسی کوششیں کس حد تک کامیاب ہو سکیں گی؟ -

زبان کا مسئلہ جذباتی اور لسانی ہونے کے ساتھ ہی ساتھ سیاسی اور معاشی بھی ہے اور اسی لئے وہ وقتی ہونے کے علاوہ، مستقبل پر بھی اثر انداز ہوگا ہندی نہ بولنے والے علاقوں میں ایسی تحریک کا شروع ہوجانا کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ ان علاقوں میں زیادہ تر، حکومت کے ناقدین کی ہی اکثریت ہے - جنھوں نے اس مسئلہ کی آڑ میں اپنے اختلافات کا عملی شکل میں اظہار کر ڈالا - اس کے برعکس اب ہندی بولنے والے علاقوں میں ہندی کی حمایت میں مظاہرے شروع ہوگئے ہیں ان مظاہروں کی قیادت رجعت پسند و فرقہ پرست جماعتوں کے ہاتھوں میں ہے اور یہ بھی حکومت کی مخالف ہیں بات اصولوں کی بنیاد پر کوئی نہیں کر رہا - سب کے سب اپنے دل کی بھڑاس نکال رہے ہیں حد تو یہ ہے کہ علاقائی اور عصبیتی سوچ اس پیمانے پر جا پہنچی کہ خود حکمراں جماعت کانگرس کے رہنما اور کارکن، حکومت کے خلاف تحریک میں شامل ہیں اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ صوبائی تو صوبائی - مرکزی وزراء تک نے استعفے دے ڈالے —— اور سب سے بڑی حماقت تو یہ ہے کہ ہندی کے خلاف مگر انگریزی کے حق میں دلائل پیش کئے جارہے ہیں - مسئلہ ہے تو یہ کہ ہندوستان جیسے کثیر اقوام اور کثیر زبانوں، والے ملک میں صرف ایک زبان سرکاری زبان نہیں بنائی جا سکتی - "ایک دیش" اور "ایک زبان" کا نعرہ ہندوستان جیسے ملکوں میں نہ کبھی چلا ہے اور نہ چلے گا اور پھر ایسی کوئی غیر معمولی شخصیت بھی بھارت میں نہیں ہے جو سارے عوام کو اپنے اثر و رسوخ سے کچھ نہ کچھ عرصہ تک کسی نہ کسی حد تک اس نعرے پر جمع کر سکے - بات بالکل، سیدھی سادی ہے کہ ہندوستان میں تمام قومیتوں کی ثقافت، معاشرت اور زبانوں کا پورا پورا احترام کیا جائے ان کے پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کئے جائیں - اور عملی طور پر قوموں کی مساوات ہر میدان میں تسلیم کی جائے - اگر یہ سب کچھ ہوتا ہے تو بات بنتی ہے - بصورت دیگر یہ بحران اور یہ مزاج گھٹنے کی بجائے بڑھتا ہی چلا جائیگا

بھارت ہمارا ہمسایہ ہے - وہاں پر کسی بھی قسم کے انتشار و خلفشار کا لازمی اثر خود ہم پر بھی پڑتا ہے - یہ لسانی جھگڑے تو خیر ابھی حال ہی میں شروع ہوئے ہیں اس سے بہت پہلے ہی سے یہ مختلف ہنگاموں کی - آماجگاہ بنا ہوا ہے - ہندوستان کو فوجی تیاریوں اور ناموافق موسمی حالات کی وجہ سے بدترین غذائی بحران کا سامنا کرنا پڑا - جس سے نبٹنے میں وہاں کی حکومت قطعی ناکام رہی، وہ قیادت جو گزشتہ ۱۸ سال میں ہندوستان کے بنیادی مسائل کو حل کرنے میں ناکام رہی، جس نے سرمایہ داروں کو کھلی چھٹی دی اور مزدوروں اور کسانوں کو کچل کر رکھ دیا —— بھلا پندار اور بھرم کب تک قائم رکھ سکتی تھی - بہرحال اپنی جھوٹی قیادت برقرار رکھنے کے لئے - ہندوستانی زعماء نے امریکہ اور برطانیہ سے فوجی گٹھ جوڑ کرلیا - ہند چینی تنازعہ کے زمانے میں ہندوستانی عوام کے جذبۂ قوم پرستی کے ساتھ جو فریب کیا گیا وہ ہر لحاظ سے قابل مذمت ہے - ہندوستانی عوام نے حب الوطنی کے چکر میں اپنے ان نیتاؤں کو اپنا سب کچھ دیدیا اور اس کے بدلے میں انھیں کیا ملا —— بھوک اور بیکاری، جمہوری آمریت اور معاشرتی بدامنی!

ہم پاکستانی جانتے ہیں کہ استعماری گرفت کتنی مطبوط ہوا کرتی ہے - کوئی ملک جب سامراج کے معاشی اور فوجی چنگل میں پھنس جاتا ہے تو بڑی مشکل سے رہائی ملتی ہے -

ہندوستان کا موجودہ برسراقتدار گروہ عوام سے کٹا ہوا ہے اور وہ اپنے بنگلوں میں بیٹھ کر ان کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے کا خواہشمند ہے ہمیں یہ یقین ہے کہ یہ صورتحال زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتی، ہندوستان کے باشعور عوام ایک نہ ایک دن ان تمام نام نہاد لیڈروں کی قسمت کا فیصلہ بھی کر ہی دیں گے اور دراصل وہ دن ہندوستان کے عوام کی نجات کا دن ہوگا!

متحدہ عرب جمہوریہ

صدر ناصر کا راست اقدام

صدر ناصر نے مشرقی جرمنی کے صدر البرخٹ کو متحدہ عرب جمہوریہ کے دورے کی دعوت دی تو مغربی جرمنی کے رہنماؤں نے ناک بھوں چڑھانا شروع کر دیا اور مغربی سربراہوں کی روایتی کم ظرفی کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے انھوں نے بھی یہ دھمکی، دیدی کہ اگر مشرقی جرمنی کے صدر، متحدہ عرب جمہوریہ کے دورے پر آئے تو مغربی جرمنی اسے ایک غیر دوستانہ فعل سمجھتے ہوئے مصر کی امداد بند کردیگا



صدر ناصر

صدر ناصر نے بھی اپنی روایتی خود اعتمادی کے ساتھ مغربی جرمنی کے کرتا دھرتاؤں کو لتاڑ ڈالا انھوں نے صاف صاف کہا ہے کہ مغربی جرمنی جو امداد بند کرنے کی بات کر رہا ہے وہ امداد نہیں بلکہ، قرض ہے جسکی بمعہ سود ہم ادائیگی کر رہے ہیں ۔ اور رہا دوستی کا سوال تو ہم مغربی جرمنی کو بھلا اپنا دوست کیونکر سمجھ سکتے ہیں جبکہ مغربی جرمنی، عربوں کے دشمن نمبر ایک ـــــ اسرائیل کو ۔ باقاعدہ اور مسلسل و مستقل فوجی سامان فراہم کر رہا ہے ۔ صدر ناصر نے واشگاف الفاظ میں کہا ہے کہ ان حالات کی روشنی میں اگر مغربی جرمنی اپنی نام نہاد " امداد " بند کر دینا چاہتا ہے تو کر دے ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں ـــــ مشرقی جرمنی کے صدر کو ہم نے مدعو کیا ہے اور وہ پروگرام کے مطابق مصر کا دورہ کریں گے ۔ اور ان کا ایک مملکت کے سربراہ کی حیثیت سے سرکاری پیمانے پر شایان شان استقبال کیا جائیگا

سارا مسئلہ یہ ہے کہ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد، فاتح قوموں نے جرمنی کے حصے بخرے کر لئے تھے ۔ مغرب کے امریکی برطانوی اور فرانسیسی حصوں پر جو حکومت قائم ہے ۔ وہ مغربی ممالک کی حلیف ہے اور مشرق کے روسی حصے کی حکومت روس کی طرفدار ہے ۔ یہ تقسیم ایک طرح سے مستقل شکل اختیار کر چکی ہے اور اب مشرقی اور مغربی جرمنی کے درمیان نہ صرف ذہنی سیاسی اور معاشی بلکہ کنکریٹ اور خاردار تاروں کی دیواریں حائل ہیں ـــــ چنانچہ اسی درمیانی خلیج کی وجہ سے مغربی جرمنی کے حکمرانوں کو صدر ناصر کی یہ بات بری لگی کہ انھوں نے مشرقی جرمنی کے سربراہ کو دعوت دی جبکہ سفارتی تعلقات مغربی جرمنی سے ہی قائم ہیں ۔ مگر صدر ناصر نے مغربی جرمنی کے حکمرانوں کی بوکھلاہٹ میں یہ کہکر مزید اضافہ کر دیا کہ بھئی مشرقی اور مغربی جرمنی کے مسائل تو آپکے اپنے ہیں انھیں آپ برلن میں ہی طے کیجئے آخر قاہرہ کو اس جھگڑے سے کیا تعلق ـ ؟

صدر ناصر کے اس موقف سے مغربی جرمنی اور مغربی سامراجیوں کی صفوں میں کھلبلی پڑ گئی ہے ۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ دنیائے عرب کے اس مقبول ترین رہنما نے اگر مشرقی جرمنی کو تسلیم کر لیا تو اس کا خمیازہ نہ صرف مغربی جرمنی بلکہ امریکہ اور برطانیہ اور دوسرے سامراجی ممالک کو بھی بھگتنا پڑے گا ۔

صدر ناصر نے اسرائیل کے وجود کے بارے میں کہا کہ مشرق وسطیٰ کے بیچوں بیچ یہ استعماری " اڈہ " سامراجی فتنہ سازوں کے فوجی، معاشی، سیاسی اور مذہبی مقاصد کے تحت قائم کیا گیا ـــ اور آج امریکہ برطانیہ مغربی جرمنی کے اسلحہ پر ہی اس کا وجود قائم ہے اور انھیں کے بل بوتے پر اسرائیل اپنے جارحانہ و عرب دشمن عزائم و حرکات کا مظاہرہ وار تکاب کرتا رہتا ہے ۔

انھوں نے مغربی جرمنی کے سربراہوں کے نندر لنگ کی بھی اچھی طرح خبر لی ہے کہ اسرائیل کو جنگی سامان تو وہ " انتہائی دباؤ " کے تحت دے رہے ہیں ۔ انھوں نے کہا کہ اس حقیقت کے پیش نظر پھر آخر مغربی جرمنی کو ایک آزاد اور خود مختار مملکت سمجھنا کہاں تک درست ہو گا اور آخر مغربی جرمنی امریکہ کے اشارے پر ناچ ہی کیوں رہا ہے ؟ انھوں نے مغربی جرمنی کے حکمرانوں سے کہا کہ جس طرح وہ انتہائی دباؤ کے تحت اسرائیل کو امریکی اسلحہ پہنچانے پر مجبور ہیں ۔ اس طرح، اس کے " انتہائی دباؤ " میں آنے کے لئے ہم قطعاً مجبور نہیں ہیں ۔

اپنی دھمکی کا اتنا دندان شکن جواب پاکر مغربی جرمنی کے رہنماؤں کو جھکنا ہی پڑا اور وہ اب یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ اچھا ہم اسرائیل کو فوجی امداد دینا بند کئے دیتے ہیں تم اس کے بدلے میں مشرقی جرمنی کے صدر البرخٹ کو نہ بلاؤ ۔ لیکن دنیا جانتی ہے کہ ناصر جب ایڈن، خروشچیف اور کینیڈی کو خاطر میں نہ لائے تو بھلا یہ چھٹانک چھٹانک بھر کے مقامی افراد کیا اہمیت رکھتے ہیں ؟ چنانچہ انھوں نے جو کہا اس پر ڈٹے رہے اور اب تازہ ترین خبر یہ ہے کہ مشرقی جرمنی کے صدر عرب جمہوریہ کے دورے پر روانہ ہو چکے ہیں ۔

اس انقلابی شخصیت نے ہمیشہ کی طرح یہ پالنسہ بھی بڑی سوچ بچار کے بعد پھینکا ہے ۔ اگر مغربی جرمنی، اسرائیل کو فوجی اسلحہ فراہم کرتا رہا تو یہ یقینی امر ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ مغربی جرمنی سے اپنے سفارتی تعلقات توڑ لے اور مشرقی جرمنی سے دوستانہ تعلقات قائم کر لے ـــ اور مغربی جرمنی جو آج دشمن ہوتے ہوئے دوست بنا بیٹھا ہے اپنے حقیقی روپ میں ایک عرب دشمن ملک کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آجائے ـــ دوست اور دشمن کو، پہچاننے کی یہ ہی وہ صحیح ترین خارجہ پالیسی ہے جو صدر ناصر نے ترتیب دی ہے اس کا مقصد صرف متحدہ عرب جمہوریہ کا ملکی، محدود، اور مقامی مفاد ہی نہیں ہے بلکہ محکوم نو آزاد قوموں کی حقیقی اعانت نیز افریشیائی اور لاطینی امریکہ کے عوام کے وسیع ترین مفادات کی عملی تائید و حمایت بھی ہے اور اس ترقی پسندانہ سامراج دشمن خارجہ پالیسی کو اختیار کر کے متحدہ عرب جمہوریہ دوسرے ممالک کے مقابلے میں کم آبادی اور کم رقبے کے باوجود عالمی وقار اور رتبہ کا حقدار اور مستحق ہے اور حقیقتاً یہ ہی وہ پالیسی ہے جسکو نہ اختیار کرنے والی دوسری افریشیائی، افریقی اور لاطینی امریکہ کی ریاستیں دراصل سامراجی ہاتھوں میں کھیل رہی ہیں ۔

ویت نام

امریکی جارحیت کے مقابلے پر

گذشتہ سال اگست میں امریکی جارحیت پسندوں نے خلیج ٹونکن میں اپنے بحری جہازوں پر شمالی ویٹ نام کے حملہ کا بہانہ تراش کر شمالی ویت نام پر بمباری کی تھی ۔ گو دراصل یہ حقیقت اسی وقت سب پر عیاں ہو گئی تھی کہ امریکہ اس علاقے میں ہر قیمت پر جنگ پھیلانے پر تلا ہوا ہے ۔

اس دفعہ بھی امریکہ کی شمالی ویت نام کی حالیہ بمباری سے ایشیائی عوام نے امریکی جارحیت کو ننگے اور بھیانک روپ میں دیکھ لیا ہے اور یہ بھی جان لیا ہے کہ امریکہ کو تیسری جنگ عظیم کی ابتدا کرنے میں کسی قسم کی کوئی جھجک نہ ہو گی بلکہ دراصل امریکہ نے تو اپنی طرف سے جنگ کا آغاز کر ہی دیا ہے ۔ یہ تو اب سوشلسٹ بلاک پر منحصر ہے کہ وہ شمالی ویت نام پر امریکہ کے ان جارحانہ حملوں کے جواب میں کیا رویہ اختیار کرے گا

امریکہ کے اس جارحانہ اقدام کی نزاکت و پیچیدگی کے پیش نظر دنیا کے کونے کونے میں شدید



شمالی ویٹ نام پر حملہ کے خلاف ڈھاکہ کے طلباء کا احتجاج

میں ہے — اب ہم سب کا فرض ہے کہ اس جارحیت، اس خطرے کا جم کر مقابلہ کریں —

امریکہ کے پاس اس چھوٹی سی کمزور ریاست شمالی ویت نام کی آزادی، خود مختاری اور سالمیت پر حملہ کرنے کا یہی (شرمناک) جواز تھا کہ شمالی ویت نام کی حکومت ویٹ کانگ گوریلوں کی اعانت کر رہی ہے — یہ جواز بذات خود کوئی بنیاد نہیں رکھتا اور نہ ہی کوئی ثبوت — بہرحال اگر اس منطق کو سہی بھی مان لیا جائے تو کیا امریکہ اس منطق کے تحت روس پر حملہ کرنے کی جرأت کریگا۔ کیونکہ اب تو روس نے کھل کر اعلان کر دیا ہے کہ روس جنوبی ویٹ نام کے عوام کی جدوجہد آزادی کی حمایت کرتا ہے نیز ہر قسم کی اعانت کرے گا — یقیناً امریکہ کی یہ ہمت نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو شمالی ویت نام کی کمزور حکومت پر حملہ کر سکتا ہے اور امریکہ دنیا کو اسی جنگل کے قانون کے دور میں لے جانا چاہتا ہے جس کے تحت طاقت ور کمزوروں کو دبانے کا حق رکھتا ہے۔

وہائٹ ہاؤس سے اس سے قبل بھی بارہا اعلان ہو چکا تھا کہ امریکہ اس علاقے میں جنگ نہیں پھیلائے گا اور شمالی ویت نام پر حملے کے بعد پھر یہی اعلان کیا گیا — اس اعلان کے بعد پھر حملہ کیا گیا ——

—— اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ امریکہ کے قول اور فعل میں کتنا گہرا تضاد ہے اور پھر چینی رہنماؤں کی وہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ امریکی جنگ بازوں سے بقائے باہمی کی بات کرنا ہی فضول ہے۔ بلکہ ان کے ساتھ سخت بہت ہی سخت رویہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے — تاکہ یہ اپنی حدود میں رہیں ورنہ یہ نئی نو آبادیات کا حامی سامراج اپنے تجارتی اور سیاسی مفادات کے لئے جانے کیا کچھ کر ڈالے۔

جانسن جو امن د امان کا حامی گردانا جاتا تھا وہ بھی بین الاقوامی اصولوں اور جنیوا کانفرنس کے طے شدہ معاہدوں کی جس طرح اہانت امریکہ نے کی ہے وہ ہٹلر کی یاد تازہ کرتے ہیں — اور جس منطق کے تحت شمالی ویت نام پر حملہ کیا گیا وہ بھی نازی منطق سے کم نہیں — گویا امریکہ کا موجودہ برسر اقتدار طبقہ نے جس کی قیادت صدر جانسن کے ہاتھ میں ہے۔ جس انداز سے عالمی رائے عامہ اور بین الاقوامی اصولوں کو نظر انداز کر کے صرف اسلحہ پر بھروسہ کرنا شروع کر دیا ہے وہ یقیناً دنیا کو ایٹمی جنگ کا ایندھن بنا دیگی ——

انسان اور اسکی ہزاروں سال کی پرورش کی ہوئی تہذیب سب کچھ چند پاگل، چند سرمایہ داروں کے ہاتھوں خطرے

ترین مذمت کی گئی ہے۔ پاکستان، انڈونیشیا۔ فرانس، مصر، عراق، شام، روس، چین کے عوام نے امریکہ کے ان جنگی عزائم کے خلاف اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ برطانیہ میں مظاہرے ہوئے اور تو اور امریکہ تک میں احتجاجی جلوس نکلے لیکن واہ رے نمک خوار وفادار کہ اپنے آقائے نامدار کے جوتے چاٹنا ہی، اپنا مقدر بنا بیٹھا ہے۔ یہ تھا ایک ایشیائی ملک کا ایشیائی وزیر اعظم تنکو عبدالرحمٰن۔ برطانوی نو آبادی ملائیشیا کا سربراہ —!

یہ حملہ اس وقت کیا گیا جب روس کے وزیر اعظم کوسیجین شمالی ویٹ نام کے دورے پر تھے اور اگر امریکی انداز فکر کے حامل سوشلسٹ بلاک کے رہنما بھی ہوتے تو یقیناً ایشیائی سرزمین پر تیسری عالمگیر جنگ چھڑ گئی ہوتی۔

امریکہ پے درپے شرمناک شکستیں اٹھانے کے بعد جس جنگی ہسٹریائی دورے میں مبتلا ہو گیا وہ کوئی نہ سمجھنے والی بات نہیں ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ امریکہ اپنے لاکھوں ڈالر اور ہزاروں فوجی مشیروں کی فوجی اعانت کے باوجود جنوبی ویت نام کی جنگ ہار رہا ہے اور ہر آنے والے دن کے ساتھ ویت کانگ حریت پسندوں کا حلقۂ اثر بڑھتا جا رہا ہے — دنیا کی اتنی بڑی فوجی طاقت جب مٹھی بھر نہتے حریت پرستوں کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست اٹھائے تو اس پر جنگ کے دورے پڑ سکتے ہیں۔ لیکن یہ کسی طرح بھی کوئی جواز نہیں بن سکتا کہ شمالی ویت نام پر حملہ کر دیا جائے ——



ہم امریکیوں کو دندان شکن جواب دیں گے (ہوچی منہ)

کسی طرح گولڈ واٹر سے کم نہیں نکلا۔ اپنی دور حکومت کے مختصر سے عرصہ میں اس جنگ باز نے کانگو، لاؤس اور ویت نام پر براہ راست حملہ کر کے امن کی بنیادیں ہلا کر رکھدیں ــــ اور یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ امریکہ کی کرسئ صدارت پر دنیا کے سب سے بڑے جنگ باز قابض ہیں اور دعوٰی یہ کرتے ہیں کہ امریکہ جنوبی ویٹ نام کی آزادی کی ہر قیمت پر حفاظت کرے گا۔

نام نہاد آزاد دنیا کا خود ساختہ محافظ جب آزادی کی بات کرتا ھے تو انسانی ذھن سوچنے لگتا ھے کہ کیا امریکی لغت میں آزادی کے معنی دوسرے علاقوں میں فوجی اڈے قائم کرنا، معاشی استحصال کرنا ــ خود مختاری پر حملہ کرنا ھے ــــ

ورنہ جہاں تک آزادی کا تعلق ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ دوسرے ممالک کی خود مختاری کا احترام کیا جائے اور ہر ملک کے عوام کو انکے منشا کے مطابق زندگی گزارنے کا حق دیا جائے لیکن امریکہ جنوبی ویت نام کے عوام کے اس حق کو اپنے فوجی بل بوتے پر سلب کرنے کی ناکام کوششوں میں لگا ہوا ہے۔ ویت نام کے عوام نے ویٹ کانگ حریت پرستوں کی رہنمائی میں تین چوتھائی کے قریب علاقہ امریکہ اور اس کے پٹھوؤں کے اقتدار سے نکال لیا ہے اور باقی علاقہ بھی آج نہیں تو کل سے آزاد ہو کر ہی رہیگا۔

جہاں تک جنوبی ویٹ نام کی کٹھ پتلی حکومت کا تعلق ہے تو اس کے استحکام کا پتہ آئے دن کے انقلابات سے چلتا ہے اور حالیہ انقلاب میں جنرل کھان کو اقتدار سے الگ کر دیا گیا۔ ہر روز نئے انقلاب کی سازشیں امریکی سراغ رساں (CIA) کا ادارہ کرتا ہے جسکا مقصد صرف یہی ہے کہ کوئی بھی حکومت مستحکم بنیادوں پر قائم نہ ہونے پائے تاکہ امریکہ کی برتری قائم رہ سکے۔

امریکہ نے شمالی ویٹ نام پر حملہ شاید یہ سوچ کر کیا تھا کہ اس طرح ممکن ہے ویٹ کانگ گوریلوں کی سرگرمیوں میں کمی ہو جائے لیکن اس کا یہ اندازہ بالکل غلط نکلا بلکہ اسکے بعد ویٹ کانگ گوریلوں کی سرگرمیوں میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے جس کے نتیجہ میں کتنے ہی امریکی "مشیر" اور کٹھ پتلی حکومت کے فوجی مارے جا چکے ہیں ــــ

ادھر یہی وجہ ھے کہ امریکہ نے شمالی ویٹ نام پر بمباری کے فوراً بعد امریکی خاندانوں کو جنوبی ویٹ نام سے منتقلی کا حکم دیدیا جنگ تو امریکی مفادات کے لئے ویٹ نام کی سرزمین پر ھو ــ نشانہ ویٹ نامی بنیں ــ گھر ویٹ نام کے عوام کے لٹیں

اور امریکی خاندان "محفوظ" مقام پر پہنچا دیئے جائیں ــــ

اس حملہ کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ویٹ کانگ گوریلوں کی بیرونی اعانت کا سلسلہ بند کر دیا جائے لیکن انھیں بیرونی امداد کی ضرورت ہی کیا ہے کیونکہ انکو امریکیوں نے خود ہی کافی مسلح کر رکھا ہے

امریکی ماہرین یہ جانتے ہیں کہ ویٹ کانگ حریت پرست سالہا سال تک کسی بیرونی امداد کے بغیر لڑ سکتے ہیں اور انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہند چینی کے انقلابی عوام امریکیوں کی غلامی قبول نہیں کریں گے وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن انھیں شکست کا منہ دیکھنا ہے۔ لیکن اس آخری شکست سے پہلے نازیوں کے نمائندے اپنے آخری دم خم دکھا رہے ہیں۔ انھوں نے ایٹمی ہتھیار بھی پہنچا دیئے ہیں اور ساتواں بحری بیڑہ بھی تیار کھڑا ہے ــ دیکھنا یہ ہے کہ یہ ڈرامہ کتنے دنوں تک کھیلا جا سکتا ہے ــ دیکھنا یہ ہے کہ ڈین بن پھو کا سبق کب دھرایا جاتا ہے اور بقول چینیوں کے ــــ

"ھم ایک بار جنگ کوریا میں امریکہ کو ذلت آمیز شکست دے چکے ھیں اور اگر وہ یہ سبق بھول گئے ھیں تو ھم "دوبارہ یاد دلا سکتے ھیں۔

امریکیوں کو وہ سبق یاد دلانا ضروری ھے ورنہ بقول برٹرنڈ رسل "پوری دنیا امریکی کی غلام بن جائے گی"

لیکن اتنا ہم بھی جانتے ہیں کہ وہ قومیں جو دنیا کو غلام بنانے کے لئے نکلیں انکا انجام انتہائی عبرت ناک ہوا۔



سائگان کے امریکی اسکول سے بچوں کا انخلاء



ھٹلر کے نئے روپ

:- جنرل ولیمٹ مورلینڈ ـ جنرل ٹیلر ـ اور بنڈی ـ





ہرچرن چاولہ

میٹھا زہر

بڑے بھائی بالمکند نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ وہ ہاتھ لہرا لہرا کر شور مچا رہا تھا۔ اور شام گلی کے لوگ اپنے بچوں کو کندھوں پر اٹھائے پاؤں کے نیچے چوکیاں کرسیاں اسٹول یا میزیں رکھے اور گردنیں لمبی کئے۔ اس نئے شو کا نظارہ کرنے میں محو تھے۔ جب سے ڈاکٹر نیتا نند نے یہ مکان آکر آباد کیا تھا۔ محلہ والوں کے لئے مفت سینما دیکھنے کا خود بخود سامان ہو گیا تھا۔ ہر روز کسی نہ کسی وجہ سے۔ کسی نہ کسی بہانے چاروں بھائیوں میں کبڈی شروع ہو جاتی تھی۔ اور [illegible] کھول کر ان کی بہادری کی داد دیتا ویسے تو محلے میں اچھے پڑھے لکھے لوگ تھے۔ مگر جب سے یہ گھرانہ اس محلہ میں آکر آباد ہوا تھا۔ انکی خاموشی کے سالن میں یہ تھوڑی سی کھٹ پٹ نمک مرچ کا کام دے جاتی تھی۔ ویسے بھی شریف لوگ اس لئے ان سے ڈرتے تھے کہ اگر کوئی انھیں چھڑانے بھی آجاتا تو اپنی ہڈی پسلی ایک کروا کر ہی واپس جاتا پہلے پہل جب ان جنگجو برادران میں ہاتھا پائی ہوئی تھی اور پڑوسی پیرا غیر انھیں سمجھانے آیا تھا تو وہ منہ ماتھا سجا کر واپس گھر پہنچا تھا جسکی وجہ سے وہ بے چارہ ایک ہفتہ کالج نہ جا سکا اور محلہ میں علیحدہ چاروں بھائیوں کی بہادری کا اشتہار بنا پھرا۔ اب تو بس محلہ تماشبین بن کر شو دیکھا کرتا۔ نزدیک آنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔

تو شادی نہیں کرے گا۔ تیری ایسی تیسی —

شادی تو تیرے باپ کو بھی کرنی پڑے گی۔ تو اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ میں تیری ہڈی پسلی ایک کردوں گا سرمہ بنا کر نہ رکھ دوں تو بالمکند نام نہیں۔ او دیشے سمجھالا اسے"

وہ غصہ سے پھنکارتا ہوا کرسی پر جا بیٹھا۔ بھاگ دئی نے بالمکند کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ جسے بالمکند نے غصہ سے بری طرح جھٹک دیا۔ وہ پرے جا کھڑی ہوئی۔ اور نرمی سے بولی "بٹیا تو فکر نہ کر۔ میں سب ٹھیک کر دوں گی"

وہ سوچوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گئی۔ کل ہی تو اس نے تیسرے لڑکے راج پال کا شگن لیا تھا۔ مگر آج وہ شادی سے انکار کر رہا تھا۔ کیوں؟ بس شوقیہ یا محلہ والوں کی رنگینیٔ طبع کے لئے۔ بڑا لڑکا اس کے انکار پر جلا بھنا پاگل ہو رہا تھا۔ غصہ میں اس کی باچھوں سے ادھر ادھر جھاگ اڑ رہی تھی۔ بھاگ وئی سوچ رہی تھی کہ وہ اپنے خاوند ڈاکٹر نیتا نند کو ابھی سے بلائے یا نہیں۔ اسے شادی سے دو روز پہلے آنا تھا کیونکہ یہاں سے چار سو میل دور بودن پودی قصبہ میں وہ دونوں ہاتھوں سے چاندی سمیٹ رہا تھا۔ وہاں کوئلے کی کانوں میں کام کرنے والے غریب مزدوروں کو پانی کے ٹیکے لگا لگا کر اس نے ہزاروں جوڑ لئے تھے۔ خود بھاگ وئی جسے ابھی نبض پکڑنی نہیں آتی تھی وہاں ڈاکٹرنی بن گئی تھی۔ مزدوروں کی پردہ دار عورتیں اس کے پاس علاج کے لئے آتیں۔ وہ ان کا تمام حال نوٹ کر کے مطب کے اندر پوشیدہ کمرے میں نیتا نند سے حال بتا کر انکی دوا لے آتی۔ اس طرح علیحدہ لیڈی ڈاکٹر کی مدد کے بہانے وہ ان سے ریٹ سے کچھ زیادہ ہی اینٹھ لیتی۔ وہ غریب اف نہ کرتیں۔ بھاگ دئی کو خود پہلے آجانے کا افسوس تھا۔ پھر وہ ڈاکٹر کو اپنے بیٹوں کے معمولی جھگڑے کی وجہ سے کیسے اتنی جلدی بلا کر سیکڑوں پر پانی پھیر دیتی۔ اسی وجہ سے وہ ٹھنڈے دل سے حالات پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر راج پال کسی طرح راضی ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ اسے شادی سے نفرت ہو۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو شادی کے لئے ایک عرصہ سے بے چین تھا۔ جانے کس نے اس کے دل کے آئینے میں بال ڈال دیا تھا۔ اسکی ہونے والی بیوی خوبصورت نہیں یہ دوسری بات ہے کہ وہ خود خوبصورت تو کیا معقول

صورت بھی مشکل سے مانا جاتا تھا۔ مگر پھر بھی بھگوان نے اسے خوبصورتی کا قدر دان دل عطا فرمایا تھا۔ یہی حال کچھ اس کے بھائی دیشے کا تھا۔ اس نے بھی ایک چھوڑ دوسری کی تھی پہلی اسے پسند نہیں آئی تو اس نے گھر سر پر اٹھا لیا تھا۔

"مجھے کس ڈھانچے سے بیاہ دیا ہے۔ میری زندگی برباد ہو گئی۔ اس سے اچھا تھا میں زندگی بھر کنوارا رہتا۔"

ڈاکٹر نیتانند نے اس کی زندگی برباد نہیں کی تھی۔ چاہے کسی کی بیٹی کی زندگی برباد ہو کر رہ گئی۔ ڈاکٹر نے خواہ مخواہ لڑکی کو ٹی بی کا مریض قرار دے دیا اور اسی بہانے دیشا ایکدن اسے اپنے میکے چھوڑ آیا۔ اور پھر زندگی بھر اسکی بات نہیں پوچھی۔ چلتے چلتے لڑکی کے ماں باپ کے جوتے گھس گئے مگر ان لوگوں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر صاحب نے دیشے کو نئی دلہن دلوادی۔ خوبصورت اور سڈول اعضاء والی ڈاکٹر صاحب خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنے گئے تھے۔ دیشا اب نئی اور خوبصورت بیوی پاکر مطمئن تھا جب وہ اس کے ساتھ کھڑا ہوتا تو ایسے لگتا جیسے نئی اور خوبصورت پلائی موتھ کار کے ساتھ کسی بدتمیز نے میونسپل کمیٹی کا کچرے کا ٹرک پارک کر دیا ہو۔ دیشے نے راج پال کو ایک طرف لے جا کر کہا۔

"اوے راج۔ کتی رن دے پتر۔ اب مان بھی لے کیوں جھگڑا کرتا ہے۔ اتنے بڑے گھرانے کی لڑکی مل رہی ہے جہیز وہ ملے گا کہ زندگی بھر موج کرے گا۔"

جہیز کا خیال آتے ہی دیشے کا منہ پانی پانی ہو گیا اس کا بس چلتا تو وہ راجو کو اٹھا کر باہر پھینک دیتا اور خود اس کی جگہ بیٹھ کر کہتا "ے ماں مجھے شادی ہی تو کرنی ہے۔ یہ نہیں کرتا تو میں تیار ہوں کر دے میری شادی۔"

اسے دکھ تھا تو اس بات کا کہ وہ اب وہ بیج تھا کہ جو شادی کی بھٹی میں بھونا جا چکا تھا۔ اس لئے اسے دوبارہ بونا اور اس کا پھلنا پھولنا ناممکن تھا۔ دیشے کا یہ سوچ کر چہرہ اتر گیا کہ جہیز کچھ بھی ملے اسے کیا ملے گا سب کچھ تو راج لے جائے گا ہاں ایک امید تھی جس کا دامن تھامے وہ راج کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا اور کچھ نہ سہی اسے ایک گرم سوٹ تو مل ہی جائے گا۔ دیشے کو پیسوں کی تو کبھی کمی نہ رہی مگر ضروریات زندگی کی کمی وہ کبھی پوری نہ کر سکا۔ حالانکہ اپنی تنخواہ کے علاوہ بھی کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب اسے کافی موٹی رقم بذریعہ منی آرڈر بھیج دیا کرتے تھے۔ مگر وہ ہمیشہ تنگ خرچ ہی رہا کیونکہ اسے جوا کھیلنے کی لت تھی۔

بھاگ دئی بھی نمبر ایک گھاگ تھی۔ اس نے دنیا دیکھی تھی۔ بالمکند کی شادی سے پہلے اس نے ایک ایسی خوبصورت قلابازی کھائی تھی کہ بال مکند کے سسرال والوں سے سب سے اچھا جہیز جو انھوں نے بڑی لڑکی کی شادی کے لئے جمع کر رکھا تھا اپنی بہو کے لئے اپنا لیا تھا۔ حالانکہ اس کی دونوں بہنوں میں چھوٹی ہی تھی دیشے کی بھی دوسری شادی کر کے پہلی بہو کا آدھے سے زیادہ جہیز وہ بغیر ڈکار کے ہضم کر گئی تھی۔ اب راج اتنے بڑے گھر کو ٹھکرا رہا تھا یہ بھلا وہ کیسے برداشت کرتی اب اس نے ایسا جال پھیلایا کہ راج کو شادی کی حامی بھرتے ہی بنی۔ وہ اپنی ہونے والی بہو کی ایک ایسی فوٹو لے آئی جس کو دیکھتے ہی راج ہزار جان سے اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اسے یقین ہی نہ آتا تھا کہ وہ اسکی ہونے والی بیوی کی فوٹو ہے۔ وہی ناک وہی نقشہ وہی سب کچھ تو تھا مگر نہ جانے کہاں سے اتنا حسن امڈ پڑا تھا اس کاغذ کے ٹکڑے پر کہ وہ ٹوٹ کر اس پر دیوانہ ہو گیا۔ کیوں نہ ہو بھاگ دئی نے ایک چھوڑ دو چھوڑ پورے بیس روپے فوٹو پر راج کے سسرال والوں کے خرچ کروائے تھے۔ فوٹو گرافر نے اپنا تمام آرٹ اس فوٹو کے حسن کے نکھارنے میں صرف کر دیا تھا۔

جب ڈاکٹر نیتانند آیا تو حالات کافی پرسکون ہو چکے تھے۔ ویسے اس دوران بھاگ دئی کو کئی پاپڑ بیلنے پڑے کیونکہ اس کے چاروں بیٹے فلم "دو آنکھیں بارہ ہاتھ" کے قیدیوں کی طرح کنٹرول سے باہر تھے۔ انھوں نے بھاگ دئی کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ کبڈی کا شغل تو اکثر ہو ہی جاتا تھا۔ ایک رشتہ دار کا انھوں نے ٹرنک باہر پھینک دیا تھا دوسرے کے بچے کا سر پھوڑ دیا تھا چھوٹی موٹی رسہ کشی تو خیر لگی ہی رہتی تھی۔ اب ڈاکٹر کے آنے کے بعد وہ یوں خاموش ہو گئے تھے جیسے سمندر مدوجزر کے بعد ہو جاتا ہے۔ انھیں معلوم تھا کہ اب ڈاکٹر صاحب سے اپنی فرمائش پوری کرنے کا وقت آ گیا ہے ورنہ وہ اتنے بد لحاظ تھے کہ ڈاکٹر صاحب کو بھی کبھی میدان جنگ میں گھسیٹ لینے سے باز نہ آتے تھے۔

ڈاکٹر نے نئی دلہن کے سر سے نئے پیسوں کی بارش کی۔ بھاگ دئی نے دلہن کے چاند سے ماتھے پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دی۔ دیوروں نے گھونگھٹ کھول کر چہرہ دکھانے پر روپے وارے۔ راج اپنے ایگفا باکس میں نئی فلم ڈلوا لایا۔ اور آٹھوں کی آٹھوں فوٹو اپنی نئی نویلی دلہن کے لئے وقف کر دیئے اور جب نئی کے نو دن پورے ہو گئے تو نہ جانے راج کو اسکی کون سی ادا اکھر گئی کہ اس نے اسے اپنے دل سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر باہر پھینک دیا۔ بہو جائے جہنم میں جب لڑکے کو پسند نہیں تو بھاگ دئی یا ڈاکٹر صاحب اسے سر پر ماریں۔ جہیز تو اب گھر آ ہی چکا۔ ڈاکٹر صاحب نے خود وقت نکال کر بہو کا معائنہ کیا اور بتایا کہ لڑکی کو بون ٹی بی ہے اور پھر راج اپنے بڑے بھائی دیشے کے نقش قدم پر چلتا ہوا دلہن کو اپنے میکے چھوڑ آیا۔

اب راج کے لئے نئی دلہن کی تلاش شروع ہوئی۔ بھاگ دئی نے شہر کا چپہ چپہ چھان مارا۔ مگر اب اسکی ساکھ ختم ہو گئی تھی دنیا میں پیسہ ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ بھاگ دئی کی جوتیاں گھس گئیں مگر شہر میں کوئی لڑکی دینے کو تیار نہ ہوا۔ کون جیتی جاگتی اور صحت مند بیوی کے ہوتے ہوئے اپنی لڑکی کو سوت پر ٹھونستا۔ جب ہر طرف سے بھاگ دئی مایوس ہو گئی اور راج کا دماغ بھی ٹھیک ہو گیا تو وہ دلہن کو واپس لانے پر تیار ہو گئی لیکن بیشتر اس کے کہ وہ بہو کو واپس لائے اسے امید کی ایک اور کرن نظر آئی اسکے

بھائی کی ابھی ابھی موت ہوئی تھی وہ ڈاکٹر صاحب کو لے کر سیدھی اپنی بیوہ بھابی کے پاس پہنچی جو کافی دور کسی دوسرے شہر میں رہتی تھی۔ اس نے اپنی بھتیجی کے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ جیسے وہ اس کے بھائی کی بیٹی نہ ہو اس کے راج کی رانی ہو۔ وقت بہت کم تھا بھاگ دئی کو ابھی دوسری گاڑی سے واپس جانا تھا جو کہ دو گھنٹے بعد چلتی تھی ادھو بودن پودئی کی چاندی کی چمک بھی بڑی پرکشش تھی اس لئے جلد ہی وہ اپنے مطلب پر آ گئی اور اپنی بھابی سے بولی "بھابی سچی بات ہے میں تو تم سے رما مانگنے آئی ہوں اپنے گھر کی روشنی کے لئے۔"

"رما" بھابی حیران رہ گئی۔ بھاگ دئی اس سے کئی گنا امیر تھی۔ بھاگ دئی فوراً بھابی کی ہچکچاہٹ کی وجہ تاڑ گئی اور بولی۔

"ہاں رما۔ اپنے راج کے لئے۔ بھگوان کا دیا سب کچھ ہے۔ سوچتی ہوں کیوں نہ اپنی ہی بیٹی رانی بن کر میرے سامنے آئے۔ بھگوان کی سوگند کھاتی ہوں۔ راج اور رما کی جوڑی تو یوں سجے گی جیسے رادھا اور کرشن کی جوڑی پھر مجھے لالچ تھوڑی ہے کسی بات کا۔"

"بہن۔ رما جیسی میری ویسی تمہاری بیٹی۔" رماں کی ماں سوچ رہی تھی وہ زندگی بھر غریبی کی وجہ سے اپنی نند وں کی کوئی خدمت نہیں کر سکی۔ اور اب ایک مدت بعد جب اسکی ایک نند اس سے یہ رشتہ مانگ رہی ہے تو وہ کیوں اسے ناراض کرے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کے لڑکے بہت لڑاکے ہیں اور گالیاں تو انکی زبان پر رکھی ہیں مگر پھر بھی گھرانہ تو چاندی میں کھیل رہا ہے۔ ڈاکٹر نے دنیا بھر کی دولت سمیٹ رکھی ہے۔ لڑکی راج کرے گی۔ پھر یہ تو ضروری نہیں کہ وہ ہر ایک کے ساتھ ایک ہی سا سلوک کریں میری بیٹی تو لاکھوں میں ایک ہے اور پھر مزاج کی ایسی ٹھنڈی جیسے شیتل چاندنی میں غریب بیوہ عورت ہوں اس سے اچھا گھر بھلا مجھے اور کہاں سے ملے گا۔ چنانچہ اس نے فوراً یہ رشتہ قبول کر لیا۔

بھاگ دئی کو فکر تھی کہ اب۔ تو بھابی مان رہی ہے کل کسی نے بھڑکا دیا تو کہیں زبان سے پھر نہ جائے۔ پندرہ دن بعد تاریخ اس نے شادی کے لئے مانگ لی۔

بود[illegible]ئی پہنچتے ہی ڈاکٹر اور بھاگ دئی کے پیٹ میں مروڑ [illegible] لگے [illegible] لگا جیسے ان سے بہت بڑی غلطی سرزد ہو کر بغیر جہیز کے رشتہ قبول کر کے۔ وہ ایک غریب بیوہ کی لڑکی اپنا کر آخر بطور جہیز کیا حاصل کریں گے؟ جو کسی دوسرے برابر کے گھر سے تھوڑے صبر کے ساتھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ راج اس معاملے میں بالکل خاموش تھا اس کا غرور اب ماند پڑ چکا تھا۔ یہ لڑکی کافی حسین اور خوش ذوق تھی راج یہ جانتا تھا ادھر لوگوں کے انکار نے بھی اسے اپنے آپ کو کھوٹا سکہ سمجھنے پر مجبور کر دیا تھا ویسے بھی اب ایک بیوی کے زندہ ہوتے ہوئے دوسری شادی قانوناً ممنوع تھی اس کا بھی اسے علم ہو چکا تھا۔ مگر ہر کوئی تو سب قانون نہیں جانتا۔ اس لئے چپ چاپ شادی



رضا ہمدانی

پھولے پھلے ہیں بے سروسامانیوں میں ہم
اک پھول بن کے مہکے ہیں ویرانیوں میں ہم

اس پیکرِ جمال کے اعجازِ حسن سے
ڈوبے ہیں بنکے آئینہ حیرانیوں میں ہم

شاید سکوں سے دل کو کوئی ربط ہی نہ تھا
کیا مطمئن رہے ہیں پریشانیوں میں ہم

ابھرے تو اپنے آپ میں آئے نہ عمر بھر
ڈوبے تھے حسنِ یار کی طغیانیوں میں ہم

چرچا ہماری سادہ دلی کا ہے شہر میں
بدنام کتنے ہو گئے نادانیوں میں ہم

افتادِ طبع کا وہی عالم ہے آج بھی!
برباد اگرچہ ہو گئے من مانیوں میں ہم

سارے جہاں میں کوئی خریدار ہی نہیں
اتنے گراں بہا ہوئے ارزانیوں میں ہم

پاسِ وفا سے لب پہ شکایت نہیں رضا
کچھ کم نہیں کسی سے پشیمانیوں میں ہم

کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ بھاگ دئی اور ڈاکٹر میں رات رات بھر جہیز سے محرومی پر بات چیت چلتی رہتی۔ آخر اس نے شادی سے پانچ روز پہلے اندھیرے میں ایک تیر مارا اس نے بھابی کو لکھا کہ اسے اپنے ہی شہر سے ایک امیر گھرانے کی پڑھی لکھی اور خوبصورت بہو مل رہی ہے جس کا جہیز ماں باپ پچھلے ایک سال سے تیار رکھے بیٹھے ہیں۔ اس لئے وہ اتنی دور اب رشتہ کرنے سے معذور ہے۔ خط ملتے ہی رما کے گھر صفِ ماتم بچھ گئی۔ اس کا سب انتظام تو تیار پڑا تھا اب تو بس ڈولی اٹھنے کی دیر تھی۔ اگر یہ رشتہ نہ ہوا تو اسکی لڑکی زندگی بھر گھر بیٹھی رہ جائے گی۔ لوگ کیا کیا نہیں کہیں گے اس کا نوجوان لڑکا مہندر ماں کا یہ سب دکھ برداشت نہ کر سکا بولا "ماں۔ پتاجی کی انشورنس کا ملا ہوا پورا پانچ ہزار روپیہ بنک میں پڑا ہے وہ اور کس دن کام آئے گا۔ انھیں لکھ دو۔ جہیز کی جگہ یہ تمام روپیہ نقدان کے حوالے کر دیا جائے گا"

پھیرے لینے سے پہلے بھاگ دئی نے انگلیوں پر تھوک لگا لگا کر پورے پانچ ہزار کے نوٹ گن کر ڈاکٹر کی جیب میں ڈال دیئے برائے نام جہیز کی طرف اس نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ رما کی ڈولی بڑی دھوم دھام سے اٹھی۔ بھاگ دئی اس کا ماتھا چومتے چومتے دیوانی ہو گئی۔

تیسرے دن اخباروں میں ایک خبر چھپی "۱۸ مئی۔ کل رات ڈاکٹر نیتانند اور اسکی بیوی کو۔ فلائنگ رانی کے فرسٹ کلاس کے ڈبہ میں تین ہزار کے زیورات اور سات ہزار روپے نقد سے محروم کر دیا گیا۔ ڈاکو پہلے ہی سے ان کی سیٹ کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ جب گاڑی کافی دور جنگل میں نکل آئی تو وہ چہرہ پر نقاب لگائے۔ انھیں پستول دکھا کر ان سے نقدی اور زیورات چھین کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ زیورات اور نقدی وہ پورن پودئی سے شہر کے بنک میں جمع کروانے لئے جا رہے تھے"

اس نقصان کے بعد جو سب سے پہلی مدد ڈاکٹر صاحب کو ملی وہ ایک ہزار کی صورت میں راج کے سسرال کی طرف سے تھی۔ رما کی ماں نے لکھا تھا "آپ لوگوں کے نقصان کی اطلاع پا کر دل اتی دکھت ہوا۔ میں بیوہ عورت آپ کے کس کام آ سکتی ہوں پھر بھی ذرا سا پرشاد ہزار روپے کی صورت پیشِ خدمت ہے قبول فرمایئے یہ سب آپ کا ہی مال ہے"

ایک ہفتہ بعد مہندر اپنی بہن سے ملنے پودن پودئی پہنچا تا کہ اپنی بہن کو بھی دیکھ سکے اور ڈاکٹر اور بھاگ دائی سے ان کے نقصان پر اظہار افسوس بھی کرے ایکدن ٹھہرنے کے بعد جب وہ واپس آنے لگا تو اسنے رما کے ہاتھ پر سو روپے کا نوٹ رکھتے ہوئے کہا "بہن بھگوان تمہیں سکھی رکھے اپنے ساس اور سسر کو اپنے ماتا پتا سمان ماننا اور ان کا آدر کرنا"

بھاگ دئی جو پاس کھڑی تھی بولی "بیٹا تمہیں ماں نے دودھ پی کر جنا تھا بھگوان اولاد دے تو ایسی لیکن بیٹا یہ روپے کی تکلیف نہ کرو"

مہندر بولا "پھوپی میرا کیا ہے یہ سب تمہارا ہی مال ہے"۔ اور اس سے اگلا فقرہ "جو میں آہستہ آہستہ آپکو لوٹا تا رہوں گا"۔ اس نے دانتوں کی چکی میں پیس ڈالا اور تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

صبا اکبر آبادی

عشق کا پوچھتا ہے وقت مزاج
زندگی لے رہی ہے دل سے خراج

کیا زمانے میں وہ نگاہ نہیں؟
عشق ہے جس نگاہ کا محتاج

ہر نفس انقلاب ساماں ہے
حال جو کل تھا وہ نہیں ہے آج

یہ بھی ممکن ہے زورِ دستِ گدا!
چھین لے سر سے بادشاہ کے تاج

دل کے داغوں کی تازگی نہ گئی!
بارہا یہ چمن ہوا تاراج

یہ دلِ عندلیب سے پوچھو!
گل رنگیں ہے کتنا شعلہ مزاج

آنسوؤں سے بجھا کے دل کی پیاس
غم سے کرتا ہوں اپنے غم کا علاج

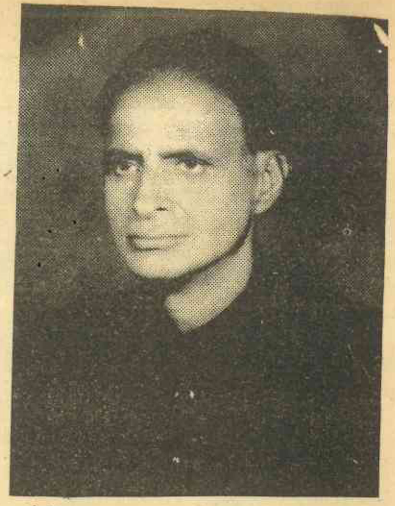
وہ ترے حسن کی پذیرائی!
وہ مرے عشق کی شبِ معراج

دل کو مایوسیاں عطا کر کے
پوچھنے آئے ہو صبا کا مزاج



آثم فردوسی

جب کبھی وسعتِ صحرا کا خیال آیا ہے!
دل مرا شہر کے ماحول سے گھبرایا ہے!
غور سے دیکھ اسے اس کو بھی پہچان ذرا
تو جسے غیر سمجھتا ہے ترا سایہ ہے
جب بھی دیکھا ہے تمہیں مجھ کو ہوا ہی محسوس
چاند جیسے مری آنکھوں میں اتر آیا ہے
ہائے وہ شخص کہ ہر روز تری محفل سے
اپنے سینے میں نیا زخم چھپا لایا ہے
کتنے آنسو میری آنکھوں میں تڑپ اٹھے ہیں
زیرِ لب جب بھی ترے نام کو دہرایا ہے
رنگ ہی رنگ ہیں پھیلے ہوئے تا حدِ نظر
کوئی شعلہ ترے رخسار سے ٹکرایا ہے
راستے اور بھی دشوار ہوتے ہیں آثم
ہمسفر جب کوئی بھولا ہوا یاد آیا ہے



رئیس امروہوی

کاش ہم فقط جسم ہوتے

کاش ہم فقط جسم ہوتے۔ اگر فقط جسم ہوتے تو کتنے اچھے رہتے۔ زندگی کے بیج سے پودے کی طرح اگتے۔ حیوان کی طرح کھاتے پیتے۔ اولاد پیدا کرتے اور مٹی کے ڈھیلے کی طرح ٹوٹ پھوٹ کر خاک کا پیوند ہو جاتے۔ بدنصیبی یہ ہے کہ ہم فقط جسم نہیں۔ کچھ اور بھی ہیں۔ یہ "کچھ اور" کیا ہے۔ روح؟ نہیں۔ اس عہد کے پڑھے لکھے لوگ روح کو نہیں مانتے۔ میں بھی پڑھے لکھوں کے ڈر سے روح کا ذکر نہیں کروں گا ورنہ بات زمین سے بڑھ کر آسمان تک جا پہنچے گی اور پھر نہ آپ سمجھ سکیں گے نہ میں کچھ سمجھا سکوں گا تو پھر ہم میں جسم کے علاوہ اور کیا ہے۔؟ ہاں زندگی ہے زندگی نہ ہوتی تو جسم جسم کیوں کہلاتا۔ تب نہ کہلاتا۔ اچھا تو جسم میں زندگی کا شمار لگانا ہم کہاں سے شروع کریں۔ کہیں سے بھی سراغ لگانے کی ضرورت نہیں۔ پورا جسم زندگی سے اس طرح لبریز ہے جسطرح سموچا پھول خوشبو سے!۔ مگر اس زندگی کے بارے میں ہمیں کیا معلوم ہے؟ صرف اتنا کہ جسم کروڑوں۔ اربوں۔ کھربوں اور سنکھوں خلیات سے ملا کر بنتا ہے اور ہر خلیے میں زندگی موجود ہے ––– یعنی ہمارے جسم کا ہر خلیہ ([illegible]) اس طرح عمل کرتا ہے جس طرح ہم خود مجموعی طور پر زندگی کو برتتے ہیں۔ خلیہ پیدا ہوتا ہے۔ زندہ رہتا ہے اور پھر مر جاتا ہے۔ گویا جسم کا ہر ذرہ بجائے خود زندگی کا ایک نظام رکھتا ہے ––– اس طرح ہمارے تین ہزار مربع انچ کے [illegible] حجم، رقبہ اور ضخامت رکھنے والے جسم میں زندگی کے بے شمار الگ الگ نظام برسرِ کار ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جسم کے اندر زندگی کے ان کروڑوں نظاموں کو ایک رشتے میں پرونے والی قوت کون سی ہے۔؟ شعور! جی نہیں ہمارے شعور کا کوئی تعلق جسم کے ان اندرونی۔ خود مختار اور فعال زندہ (خلیاتی) نظاموں سے نہیں ہے۔ ہم اپنے شعوری ارادے سے ایک خلیے کے عمل میں بھی مداخلت نہیں کر سکتے۔ پھر اس بین الخلیاتی نظامِ حیات کو لاشعور کنٹرول کرتا ہو گا۔ اس کا جواب بھی نفی میں ہے۔ پھر کون؟ کا جواب کسی کے پاس نہیں۔ (مہربانی کر کے روح کا ذکر نہ کیجئے۔ کیونکہ یہ ایک نزاعی مسئلہ ہے) نفسیات، عضویات اور حیاتیات، تینوں کے پاس اس قوت کی تشریح کے لئے کوئی موزوں اور برمحل اصطلاح موجود نہیں۔ لہٰذا کیوں نہ اس قوت کو فعال، خودشناس، خودکار موجِ حیات کہا جائے۔ فعال اس لئے کہ اس قوت کا مسلسل عمل ہی تمام خلیاتی اور عصبی نظاموں کی بقا کا ضامن ہے۔ خودشناش اس لئے کہ یہی قوت ہر خلیہ کی کارکردگی اور اس کے حدود عمل کا تعین کر کے اپنی ضرورت پورا کرتی ہے۔ خودکار اس لئے کہ یہ قوت شعوری ارادے کی گرفت سے آزاد ہے۔

بہتر ہے کہ آسانی کے پیش نظر ہم اس قوت کو "انا" کے نام سے یاد کریں یعنی میں اسے "میں" کہوں۔ یعنی یہ میں ہوں جو اپنے جسم کی بے شمار عصبی اور خلیاتی زندگی کو کنٹرول کر کے انھیں ایک مرکز کے تحت ایک مقصد کیلئے مل جل کر کام کرنے پر مجبور کئے ہوئے ہوں۔

اب ہمیں خالص نفسیات کی سرزمین میں داخل ہونا چاہیئے۔ میری اس "میں" (انا) کے کئی حصے ہیں۔ شعور تحت الشعور، لاشعور اور شعور برتر، یہ ساری چیزیں اگر انھیں چیزیں کہا جا سکتا ہے۔ میری انا۔ یا شخصیت ہی کے مختلف پہلو ہیں۔ اپنے بزرگوں کی زبان میں۔ ہم انھیں نفس امارہ، نفس لوامہ، نفس ناطقہ اور نفس مطمئنہ بھی کہتے ہیں۔ اخلاقیات اور حیات یات کے لہجے میں گفتگو کی جائے تو جبلت عقل اور ضمیر کے الفاظ استعمال کیجئے۔ خیر لفظوں کی ردوبدل سے کیا فائدہ کہنا یہ ہے کہ ہمارے جسم میں ایک خودشناس ––– خودکار اور خودمختار قوت موجود ہے۔ اور جسم اس قوت کے ہاتھ میں ایک آلۂ کار کی حیثیت رکھتا ہے

درحقیقت ہماری دشواریاں یہیں سے شروع ہوتی ہیں۔ اگر ہم فقط ایک جسم ہوتے۔ نمو پذیر جسم ہی جیسے پودا تو کوئی مسئلہ ہی نہ اٹھتا۔ کوئی سوال ہی نہ پیدا ہوتا۔ مشکل یہ ہے کہ ہم نمو پذیر جسم رکھنے کے ساتھ ایک باشعور ارادے کے بھی مالک ہیں۔ اور یہی باشعور ارادہ ہے جو جسم کو طرح طرح اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اور نفسیاتی بیماریوں کی ابتدا اسی نقطے سے ہوتی ہے۔

جس طرح ہر وہ شخص جو گفتگو میں تشبیہ اور استعارہ سے کام لیتا ہے (اور کون شخص ہے جو بات بات میں تشبیہ اور استعارہ سے کام نہیں لیتا) مثلاً یہ کہتا ہے کہ رات بھر غصّے کے مارے انگاروں پر لوٹتا رہا۔ یا فلاں کی بات سنکر جل گیا۔ صرف اس لیے شاعر نہیں کہلایا جا سکتا کہ اس نے غصّے کو انگاروں سے تشبیہ دی یا جل گیا کا استعمال کیا۔ اسی طرح ہر وہ شخص جو انسانی ذہن کے عام ردِ عمل کو پیش نظر رکھتا ہے نفسیات سے واقف نہیں ہوتا لیکن عجیب بات ہے کہ کثرت استعمال سے نفسیات بھی اسی طرح کا، ایک عوامی فن بنتا چلا جا رہا ہے جس طرح پولیٹکل سائنس۔ ۔ جسطرح اس عہد میں قومی اور بین الاقوامی سیاسی مسئلوں پر واضح وثوق اور نہایت خود اعتمادی سے گفتگو کرنا۔ ہر شخص کا شہری حق بن چکا ہے۔ اسی طرح آپ کسی کو بار بار نفسیاتی اصطلاحیں کرنے سے نہیں روک سکتے وہ بار بار کہے گا کہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے فلاں بات اس لئے پیش آئی تھی اور لاشعوری تقاضے کے پیش نظر فلاں واقعہ اس طرح ظہور میں آیا تھا آپ اسکی یہ عالمانہ گفتگو سنے جایئے اور نفسیات کی اس تفسیر و تشریح پر سر دھنے جایئے۔

ممکن ہے کہ عام نفسیات کی رو سے ہم بعض افراد کے بعض اعمال کی تہہ تک پہنچ سکیں۔ لیکن یہ نہ کوئی محفوظ طریقہ ہے نہ مفید نہ مناسب۔ پھر نفسیاتی کیس کسے کہا جائے گا۔ آیئے ذیل میں ایک سو فیصدی نفسیاتی، کیس کا مطالعہ کریں۔

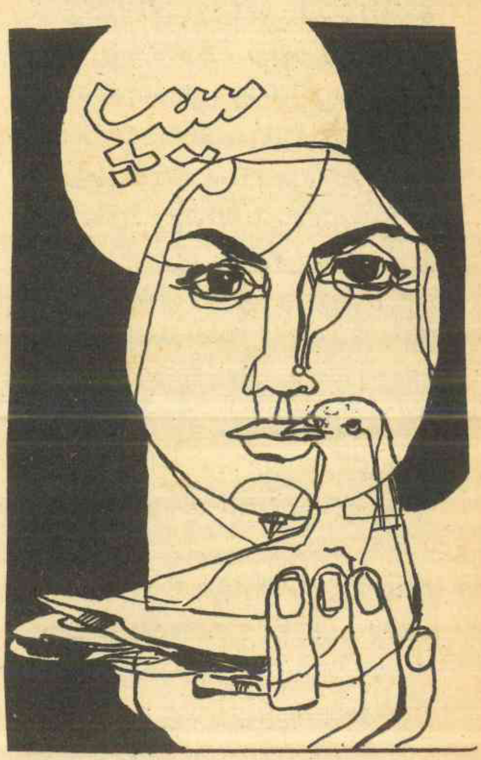
قیصر احمد (بلاک نمبر ۲ ناظم آباد کراچی) کہتے ہیں۔

میری عمر ۱۹ سال ہے۔ پہلے میں اپنے ساتھیوں میں کافی ذہین اور تیز سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب دو سال سے یہ حال ہو گیا ہے کہ دماغ بند بند رہتا ہے۔ اول تو کسی مسئلہ پر سوچ نہیں سکتا سوچنے کی کوشش کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہر معاملے میں دماغ دبیز سیاہ پردے

میں لپٹا ہوا ہے۔ سوچتے وقت ذہن رینگتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ہر معاملے میں اس قدر جلد نروس (عصبی) ہو جاتا ہوں کہ بیان نہیں کر سکتا۔ اگر میرے ہم عمر آپس میں مذاق کرنے لگیں تو میرے ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو جاتی ہیں — کسی انجان آدمی سے جم کر بات نہیں کر سکتا — دل دھڑکنے لگتا ہے اور زبان خشک ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات اس قدر ڈر جاتا ہوں کہ ٹانگیں لرزنے لگتی ہیں ڈر کا بظاہر کوئی سبب نہیں ہوتا۔ اب چار پانچ مہینے سے یہ کیفیت اور شدید ہو گئی ہے۔ اختلاج قلب کا دورہ اکثر پڑتا ہے اور رات میں سوتے سوتے جسم کا نچلا حصّہ اکثر اکڑ جاتا ہے۔ جب کوئی لڑکی سامنے سے گزرتی ہے تو یہ ساری علامتیں اور شدید ہو جاتی ہیں۔ اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے مجھے گرفتار کر لیا جائے گا۔

یہ ہے ایک نفسیاتی مریض کی صحیح اور سچی سرگذشت اس مریض میں ذہنی علامتیں بھی موجود ہیں جسمانی بھی — اور یہ دونوں آپس میں اس قدر گتھی اور گندھی ہوئی ہیں۔ اور بظاہر یہ امتیاز مشکل ہے کہ کون سی علامت خالص ذہنی ہے اور کون سی خالص جسمانی۔

(باقی ہے)



چوتھا شمارہ
شائع ہو گیا



اقبال احساس

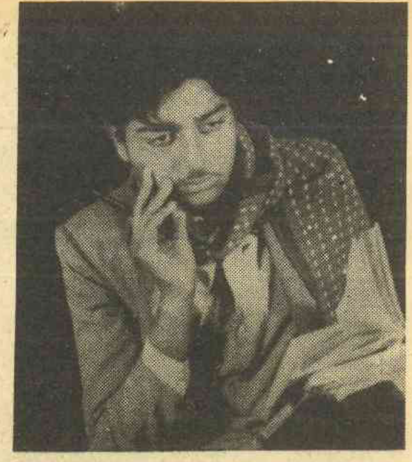
خون سے لبریز ندی پار کر سکتا ہے کون
ظلم کی دیوار کو مسمار کر سکتا ہے کون

جانے کیسی تھی ہوا جو راہبر بھی سو گیا
قافلے والوں کو اب بیدار کر سکتا ہے کون

اک نظر میں لٹ گئی اپنی متاع زندگی
زندگی سے اب نگاہیں چار کر سکتا ہے کون

حسن یوسف کو خریدا تھا زلیخا نے مگر
درد کا سودا سرِ بازار کر سکتا ہے کون

عزم نوے کر بڑھو احساس منزل کی طرف
راہ میں حائل نئی دیوار کر سکتا ہے کون



نقاش کاظمی

خون جمہور

ملوں کے منتظمو، ملک کے خداوندو
بشر بشر ہے تمہارے نظام زر کے خلاف

وہ بلبلاتے ہوئے بھوک سے جواں مزدور
پھر اپنے حق کے لئے احتجاج کرتے ہیں!
پھر آج ڈھائیں گے ایوان سیم و زر کے ستون
مل آنروں کے خلاف احتجاج کرتے ہیں

وہ سنسناتی بڑھیں گولیاں سوئے مزدور
وہ پھر سے چوٹ پڑی وقت کے تقاضوں پر

دھڑک رہے ہیں کلیجے ہزار ماؤں کے
نہ جانے کتنے جیالے اگل رہے ہیں خوں!
خموش کتنی نگاہوں نے آج دم توڑے
ہزار حیف جوانانِ عزم جوش جنوں!

ملوں کے منتظمو، ملک کے خداوندو
بشر بشر ہے تمہارے نظام زر کے خلاف

تمہارے جبر کے سینوں کو چیر ڈالیں گے
وہ خوں کے دھارے جو مزدور نے بہائے ہیں
وہ خوں تمہاری جبیں پر کلنک کا ٹیکہ
وہ خوں جو ملک کے جمہور نے بہائے ہیں



مظفر حنفی

دو ٹکے کا آدمی

اس صبح آنند نے پھر تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا تو روپے غائب تھے۔

پہلے تو دل دھک سے رہ گیا۔ اپنی لاپرواہی پر اسنے دل ہی دل میں خود کو ہزاروں صلواتیں سناڈالیں۔ پھر ٹمپریچر بتدریج بڑھتا گیا۔ نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر کچکچاتے ہوئے اس نے سوچا۔ واہ اس میں لاپرواہی اور بےخبری کا کیا سوال ہے۔ اگر اپنے ہی گھر میں اس طرح چوکنا رہنا ہو تو پھر وہ اپنا گھر کیا؟ سرائے، جنگل اور گھر میں فرق کیا رہ گیا اور یوں بھی اسے جنگل میں کوئی چیز گنوانے کا اتفاق نہ ہوا تھا ہزاروں روپے کی سرکاری آمدنی وصول کر کے وہ جس گاؤں میں بھی پڑ رہا جان و مال سے محفوظ رہا۔ ہاں سرائے میں البتہ ایک بار اس کے کپڑوں کی اٹیچی غائب ہو گئی تھی۔ لیکن یہ اپنا مکان یہاں تو روزانہ اس کی ایک نہ ایک چیز غائب ہوتی رہتی تھی اس کے دماغ میں غیض و غضب کا لاوا سا ابلنے لگا۔ اگر یہی عالم رہا تو بہت جلد وہ قلاش ہو جائے گا۔ اور یوں بھی وہ گھر کا لکھپتی نہ تھا۔ لے دے کر ایک ملازمت کا سہارا تھا جس کی تنخواہ تو اس کے جیب خرچ کی بھی کفیل نہ تھی۔ محض ساڑھے تین سو روپے۔ سفری بھتوں کو ملا کر پانچ سو کے قریب۔ سمجھ لیجئے۔ پانچ سو روپوں میں کیا ہوتا ہے روزانہ یار دوستوں کی پارٹیاں۔ ہر دسویں پندرھویں اعلیٰ آفیسران کی ضیافتیں۔ کلب میں برج اور رمی کی بازیاں ریس کورس اور پھر بمبئی جیسے غدار شہر کے مصارف، پانچ سو روپے تو یوں اڑتے ہیں جیسے تیز بگولے میں خشک پتے۔ ہاں جنگل کے ٹھیکیداروں سے آڑے وقتوں میں البتہ کچھ مل جاتا تھا۔ رشوت نہیں یہ تو بہت کریہہ لفظ ہے۔ نذرانہ سمجھئے۔ تو بس اس نذرانے کی بدولت تمام ٹھاٹ ہوتے تھے۔

لیکن اب پچھلے ماہ سے اس میں بھی کوئی شیئر ہولڈر پیدا ہو گیا تھا۔ رات کو پچاس روپے سرہانے رکھ کر سویا۔ صبح بیس ہی ملتے ہیں۔ ٹیبل کی دراز میں ڈیڑھ سو رکھ کر، حفاظت کے ساتھ تالا لگا کر دو دن پر گیا۔ لوٹا تو تالا اسی طرح لٹک رہا ہے اور دراز صاف بنک میں اکاؤنٹ کھولنا، اپنے پاؤں میں خود کلہاڑی مارنے کے مترادف تھا۔ محکمہ کی طرف سے سیکڑوں اعتراضات اٹھ کھڑے ہوتے کہ اتنا روپیہ کہاں سے آیا۔ یار دوستوں کے پاس جمع کرانے میں پول کھلنے کا اندیشہ کہ نذرانے کو رشوت نہ سمجھ بیٹھیں۔ اور پھر جمع کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ کھاؤ پیو اور مست رہو۔ اس کا مقولہ تھا وہ روپیہ خرچ کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ جمع کرنے سے بہتر تو یہ ہے کہ کیا ہی نہ جائے — لیکن روز روز کی چوریاں۔ اس کے خیالات گھوم پھر کر پھر اسی نکتے پر مرکوز ہو گئے اور غصہ کا پارہ آخری حدوں کو چھونے لگا ——

"منولال!" اس نے نوکر کو آواز دی

ایک منٹ بعد منولال اپنی جیکٹ دھوتی لٹکائے ٹھوڑی کھجاتا ہوا باورچی خانے سے نکل کر اس کے پاس آ پہنچا۔

"جی حضور! — حکم —!"

"آج پھر تیس روپے غائب ہیں —" آنند نے کہا اور غور سے منولال کے چہرے کو اور اس کے اتار چڑھاؤ کو دیکھتا رہا۔

"آں —!" حیرت سے منولال کا منہ پھیل گیا۔

آنند نے اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا اور اندر ہی اندر اترتا چلا گیا۔ کہیں کوئی جھجک کوئی خلش نہیں صاف ستھری معصوم آتما۔ آنند خجل ہو کر باہر آ گیا — نہیں منولال چور نہیں ہو سکتا۔ پھر غریب کا کوئی خرچ بھی تو نہیں ہے۔ آنند کی نگاہیں منولال کی جیکٹ دھوتی سے الجھ کر رہ گئیں۔

"صاب! اپن تو سویرے سے ہی رسوی میں ہیں" منولال نے صفائی پیش کی۔

"ارے نہیں منولال!" آنند نے جلدی سے کہا "میں تم پر شک تھوڑی کرتا ہوں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ — کہ — اچھا یہ بتاؤ صبح جب میں غسل خانے میں تھا اس وقت میرے کمرہ میں کون آیا تھا؟"

"آپ کا اردلی، عزیز آیا تھا صاحب۔ اخبار رکھنے کے لئے۔"

"ٹھیک ہے" آنند نے سوچتے ہوئے کہا "رات کو دروازہ بند تھا۔ صبح میری موجودگی میں کون نکال سکتا تھا غسل کرنے کے بعد سے اب تک میں یہی ہوں۔ بس روپے اسی اثناء میں غائب ہوئے ہیں جب میں غسل کر رہا تھا۔"

اچھا جاؤ منولال تم اپنا کام کرو۔ ہاں عزیز کو بھیجتے جانا۔"

تھوڑی دیر بعد عزیز اردلی کمرے میں داخل ہوا

"تم صبح اس کمرے میں آئے تھے —؟" آنند نے اس سے دریافت کیا۔

"جی ہاں" اردلی کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا

"کیوں —؟" آنند نے غرا کے سوال کیا۔

عزیز گھبرا گیا۔ ہکلاتے ہوئے اس نے کہا۔

"جی اخبار رکھنے کے لئے"

"کہاں رکھا تھا —؟"

"تکیے کے اوپر صاحب!"

"ہوں" آنند گہری آواز میں بولا جیسے سب کچھ سمجھ گیا ہو۔ پھر اس نے عزیز کی آنکھوں میں جھانک کے دیکھا اسکی پلکیں جلدی جلدی جھپکنے لگیں۔ آنند کو عزیز کی آتما ندامت کے بار سے دبی، سکڑی سمٹی ایک کونے میں دبکی نظر آئی۔ اس نے عزیز کے لباس پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی ——

"کتنی تنخواہ ملتی ہے تمہیں —؟"

"جی آپ ہی تو دیتے ہیں —" وہ تقریباً ہکلا کے بولا

"میں جو پوچھتا ہوں اس کا جواب دو"

"اکتالیس روپے حضور —"

"اور تم ساٹھ روپے کا اونی کوٹ پہنتے ہو —"

"جی — جی —" اردلی ایک دم بوکھلا گیا۔

"میں تمہیں برخاست کرتا ہوں"

"صاحب میرا قصور ... ؟" روتے ہوئے عزیز نے دریافت کیا۔

آنند کو ایک دم تاؤ آگیا۔

"کیوں کہ تو نے اخبار تکیے پر رکھا تھا! بھول گیا وہ وقت کمینے! جب پھٹے حالوں نوکری کے لئے گڑگڑاتا ہوا آیا تھا اکتالیس روپے تنخواہ لے کر ساٹھ روپے کا کوٹ پہننے لگا ہے سور۔۔ دور ہو جا میری نظروں کے سامنے سے۔ چل ہٹ!"

"میں نے کہا آج شام تک تو تیار ہو جاؤ گے نا!" طنزیہ لہجے میں مسٹر قریشی نے اسے پکارا۔ واقعی دیر کافی ہو گئی تھی کلب کا وقت ہو چکا تھا۔ جلدی سے تیار ہو کر آنند نکل آیا۔

"بڑی دیر کر دی یار۔۔!" قریشی نے شکایتاً کہا۔

"آج تو بڑے بڑے کھلاڑی ہوں گے۔"

"ہم کسی بڑے کھلاڑی سے کم ہیں۔" آنند نے جواب دیا۔

"وہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ انھیں انتظار ہو گا۔ ہم، لوگوں کا۔"

قریشی کی کار پر دونوں کلب کی طرف ہو لئے۔ راہ میں قریشی نے دریافت کیا۔

"مسٹر آنند یہ تو بتایئے آپ کا سابق اردلی عزیز کیسا آدمی ہے۔"

"کیوں ۔۔۔۔؟"

"یوں ہی پوچھ رہا ہوں ۔۔ کل آپ کا خانساماں۔ کیا نام ہے اس کا۔ منولال، ہاں منولال اسے لے کر میرے پاس آیا تھا کہ میں اسے اپنے یہاں نوکر رکھ لوں"

"آدمی تو۔ ۔ ۔!" آنند کہتے کہتے رک گیا۔ اگر قریشی سے چوری کی بات بتاتا ہے تو بات سے بات نکلے گی۔ بتلانا پڑے گا کہ ٹھیکداروں سے نذرانے میں ملنے والا روپیہ عزیز اکثر غائب کر دیتا تھا اور پھر وہی خدشہ سامنے تھا کہ قریشی نذرانے کو رشوت نہ سمجھ لے۔ اونہہ، مرنے دو کمبخت کو، آپ مزا چکھے گا۔

"کہتے کہتے آپ رک کیوں گئے؟" قریشی نے کہا۔

"بھئی وہ ذرا اکھڑ قسم کا آدمی ہے۔ اسی لئے نکال دیا میں نے۔ ویسے کوئی خاص برا نہیں ہے۔" ٹالنے کی غرض سے آنند نے کہہ دیا۔

"تو پھر ٹھیک رہے گا۔ مجھے مزدوروں سے کام لینے کے لئے ایک میٹ کی ضرورت بھی ہے۔ اس جگہ کے لئے ایسا ہی آدمی ٹھیک رہتا ہے۔ ابھی حال ہی میں پی ڈبلیو ڈی کا ٹھیکہ لیا ہے نا میں نے۔"

اس طرح گفتگو کا وقت دوسرے معاملات کی طرف مڑ گیا۔

قریشی اور آنند کلب پہنچے تو واقعی وہاں بڑے بڑے کھلاڑی جمع تھے۔ کپور برج کا مانا ہوا استاد آنند سے شیک ہینڈ کرتے ہوئے پراسرار انداز میں مسکرایا کہ آنند کو پوچھنا پڑا۔

"کیوں بھئی؟ کیا بات ہے؟ بڑے شگفتہ نظر آتے ہو آج تو۔"

"یہ بھی تم نے ایک ہی کہی۔" کپور قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "کیا تم نے کبھی پژمردہ بھی دیکھا ہے مجھے؟"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" آنند نے کہا۔ "پھر بھی آج کوئی خاص بات ہے ضرور۔"

"اجی ویسے ہی۔ ابھی تھوڑی دیر قبل جوشی جی برج میں بری طرح ہار گئے ہیں انھیں کی بوکھلاہٹ کے تصور سے ہنسی آگئی۔"

"تو یہ بات ہے۔" آنند نے بھی قہقہہ بلند کیا۔ ساتھ ہی اسے اپنی شب گذشتہ کی شکست یاد آگئی پچھلی رات کپور نے اس سے تقریباً دو سو روپے اینٹھے تھے۔ اس نے یکلخت سنجیدہ ہو کر کہا۔۔

"برج تو نہیں۔ رمی میں میں تمہیں چیلنج کرتا ہوں"

"یہ دم خم ہیں؟" کپور نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "رمی میں ہی سہی۔ میں ہر طرح خدمت کو تیار ہوں۔ مگر ایک بات پوچھوں تو برا تو نہ مانو گے ۔۔۔؟"

"پوچھ دیکھو۔"

"کس ٹھیکدار نے مٹھی گرم کر دی آج۔"

"کیا بکتے ہو" آنند سچ مچ گرم ہو گیا۔

"خیر نہیں بتاتے تو جانے دو۔" کپور بدستور مسکراتا رہا۔

"آؤ کھیل جمے۔"

جھنجھلایا ہوا سا آنند کھیلنے بیٹھ گیا اور پہلی ہی رنگ پر کافی پوائنٹ سے ہارا۔

"لایئے جناب داہنے ہاتھ سے ایک سو بارہ روپے آٹھ آنے۔" کپور نے ہنس کر کہا۔

"ہاں ہاں۔ یہ لو۔" کھسیانی ہنسی ہنس کر آنند نے کوٹ کی داہنی جیب میں ہاتھ داخل کیا۔ اور پھر جلدی سے بائیں جیب میں پھر باری باری اس نے کوٹ اور پینٹ کی تمام جیبیں دیکھ ڈالی۔ اسکی پیشانی عرق آلود ہو گئی اور چہرہ شرم و ندامت کی وجہ سے چقندر کی طرح لال پڑ گیا۔ کل ہی شام بہاری ٹھیکیدار سے اسے تین سو روپے ملے تھے اور اس نے نوٹ کوٹ کی جیب میں ڈال لئے تھے لیکن اب۔

"کیوں صاحب؟ کیا بات ہے۔؟ بیٹھے تو بڑے دم خم سے تھے۔ جیب میں کچھ نہیں ہے کیا۔" کپور نے تیر چلایا۔

"ساری مسٹر کپور! آنند نے شرم سے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ "آج روپے لانا ہی بھول گیا۔"

"خیر کوئی بات نہیں مل جائیں گے۔" کپور نے ظاہر دلاسا دیتے ہوئے دوسرا تیر چھوڑا۔ "اپنا تو بس اتنا کہنا ہے کہ انسان کو کھیلتے وقت پاکٹ سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔"

اس فقرے پہ پاس بیٹھے ہوئے تماشائیوں نے قہقہے بلند کئے اور آنند شرم سے سر جھکائے کلب سے باہر نکل آیا۔ گھر پہنچا تو شرم کی جگہ غصہ لے چکا تھا۔ آخر گئے کہاں وہ تین سو روپے۔ عزیز کو نکال دیا اس کے بعد تین چار دن کے لئے کچھ سکون ملا تھا کہ پھر وہی بلا گلے آپڑی۔

"منو۔ پھر وہی حرکتیں شروع ہو گئیں۔"

"کیسی حرکتیں حضور۔"

"میری جیب سے پھر تین سو روپے نکال لئے کسی نے۔ اس نے شک و شبہ کے ساتھ منولال کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کہیں کچھ نہیں۔ ندامت کی کوئی شکل نظر نہیں آئی نہ پسینے کی کوئی بوند اسکی پیشانی پر نظر پڑی۔ وہی بھولا پن، بے باکی اور معصومیت جو ضمیر کی پاکیزگی کی ضامن تھی آنند نے سوچا یہ شخص تو چور ہو ہی نہیں سکتا۔ کس طرح معصوم نظروں سے تاکتا ہے۔ ضمیر میں کہیں کوئی کسک ہو تو نظریں خود بخود جھک جاتی ہیں۔ چھی۔ میں بھی کیسے سیدھے سادے آدمی پر شک کرتا ہوں۔

"ارے ہاں سنو۔!" اس نے یاد آنے پر اچانک دریافت کیا۔ "کیا تم قریشی سے عزیز کی سفارش کرنے گئے تھے؟"

"جی ہاں۔ کیوں؟"

"کیوں کیا تمہیں معلوم نہ تھا کہ میں نے اسے ملازمت سے علیحدہ کیا ہے؟"

"معلوم تو تھا سرکار" منولال نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "لیکن اس کے گھرانے کی وشاہت خراب تھی وہ لوگ بھوکے مر جاتے۔ اور پھر یقین کے ساتھ کہا بھی تو نہیں جا سکتا کہ چور وہی تھا۔"

"چور نہیں تھا تو۔ ۔ ۔" آنند نے جھلا کر کہا۔۔ "اکتالیس روپے تنخواہ پا کر ساٹھ روپے کا کوٹ کیسے پہن سکتا تھا۔"

"ارے صاحب! وہ کوٹ۔" منولال جلدی سے بولا۔ وہ تو ٹھیکیدار اسلم خاں نے بنوا دیا تھا اسے۔"

"آنند سوچ میں پڑ گیا۔۔ "تو یہ بات تھی۔ تبھی تو میں حیران تھا کہ اردلی تبدیل کر دینے پر بھی چوریوں کا سلسلہ کیوں جاری ہے۔۔ ارے ہاں۔ اب ہر اردلی چور تھوڑے ہی ہو گا۔"

"ٹھیک فرمایا حضور نے۔" منولال نے گرہ لگائی

"خیر تو پھر میں خود ہی قریشی سے عزیز کے لئے سفارش کر دوں گا۔" آنند نے کہا۔ لیکن پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ چوریاں کون کر رہا ہے! آج مجھے کلب میں بڑی شرمندگی اٹھانی پڑی۔ ڈوب جانے کی بات تھی۔ خیر تم تو جاؤ۔"

منولال کے جانے کے بعد آنند بڑی دیر تک۔۔ سوچتا رہا۔ دوسرے دن اس نے جھاڑو دینے والی مہترانی سے لے کر پانی بھرنے والے بوڑھے تک تمام ملازم تبدیل کر دیئے۔!

پندرہ روز تک اطمینان کی زندگی گذارنے کے بعد پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ آنند کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ معاملہ وہی نذرانوں کے روپوں کی صفائی کا تھا۔ لیکن گذشتہ تمام واقعات سے سنجیدہ تر اسکی نوعیت

بیوی کی بہن نے جسے وہ اپنی بیوی سے کم نہ سمجھتا تھا اپنی،
سالگرہ کے موقع پر اس سے ایک جڑاؤ نکلس کا مطالبہ کیا
تھا۔ اور اب اسکی سالگرہ کا دن بالکل قریب آگیا تھا۔
آنند نے گزشتہ پندرہ دن کی آمدنی روک کر
تقریباً" ڈھائی ہزار روپے جمع کئے تھے۔ لیکن اس دن جب
وہ نکلس خریدنے کی غرض سے نکلا۔ تو لبی جیولرس کے
یہاں سے نالاکام و نادم ہو کر واپس لوٹنا پڑا۔ کیوں کہ بکس
سے نکال کر وہ جو پھولا ہوا منی بیگ ہمراہ لایا تھا وہ محض،
ردی اخبار کے تراشوں سے پر تھا۔!

افسوس، شرمندگی، حیرت اور غصہ اور نہ جانے
کن کن جذبات میں ڈوبتا ابھرتا وہ اپنے کوارٹر کے دروازے
سے اندر داخل ہو رہا تھا کہ سمت مخالف سے جھپٹتا ہوا،
آنے والا شخص اس سے ٹکرا گیا۔ ہڑبڑا کر آنند نے سامنے
دیکھا تو محلے کا۔ لنگڑا اور بوڑھا برہمن برجوہن ایک سرخ
رنگ کی تھیلی والہنے ہاتھ میں تھامے۔ بوکھلایا ہوا، پیٹھ کے
پیچھے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آنند کو اچانک جیسے
بجلی کا جھٹکا سا لگا "تو یہ ہے وہ چور۔!

اس نے لپک کر ایک ہاتھ سے لنگڑے کا گلا دبوچ
لیا۔ اور دوسرے سے تھیلی چھین لی۔ برہمن نے چھٹکارہ
پانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن ضعیف اور پھر لنگڑا۔
جھولے کھا کر رہ گیا۔ آنند نے تھیلی میں جھانک کر اطمینان
کر لیا۔ نکلس کے لئے جمع کئے ہوئے روپے اس میں موجود
تھے۔ چنگاریاں برساتی ہوئی آنکھوں سے بوڑھے کو کھا
جانے والی نظروں سے دیکھ کر وہ چلایا۔

"کیوں بے! کھوسٹ! سالے! یہ کہاں ملے تجھ کو"۔
"ایس ڈی او صاحب!" بوڑھے کے منہ سے
فرط دہشت میں آواز نہ نکل رہی تھی "میں نے چوری نہیں
کی ہے!"

"تو پھر کیا ساہوکاری کی ہے؟" آنند نے ایک
بھرپور چپت اس کے گال پر رسید کیا۔
جواب میں منولال نے آکر اس کے ہاتھوں سے
روپیوں کی تھیلی جھپٹ لی اور دہاڑ کر بولا ـــ
"ہاں ساہوکاری کی ہے۔ میں نے دیئے ہیں
یہ روپے اس کو!"

بوڑھے کی گردن سے آنند کی گرفت یوں ڈھیلی
پڑ گئی جیسے اسکی ساری نسیں بے سکت ہو کر جھول گئی
ہوں۔

"کیا ـ؟ کیا کہا تم نے منو ـ!"
"ہاں صاحب میں نے دیئے یہ روپے برجوہن کو
اسی بوڑھے نادار برہمن کو۔ اس لنگڑے آدمی کو ـــ
دو کنواری جوان لڑکیوں کو چتا میں پھونکنے کے بعد اب یہ
اپنی تیسری بیٹی کو شادی کی پالکی میں بٹھا کر وداع کرنا چاہتا
ہے۔ سمجھے صاحب؟ اور اس کے لئے اسے جہیز دینا پڑے
گا۔ اور آپ کے رشوت کے روپیوں کا اس سے اچھا اور کیا
مصرف ہو سکتا ہے کہ ایک لنگڑے، غریب، بوڑھے،
برہمن دیوتا کے کام آئیں۔"

اب تک آنند مورت کی طرح ہکا بکا کھڑا یہ
بکواس یوں سن رہا تھا جیسے اسے لقوہ مار گیا ہو۔ لیکن
رشوت کا نام سن کر اسکا خون کھول گیا۔ اف اتنی جرأت
اس کمبخت کی۔ نذرانے کو رشوت کہتا ہے حرامزادہ
چور کہیں کا دو ٹکے کا آدمی!

منولال کی ناک پر مارنے کے لئے اس نے
پوری قوت سے گھونسا تانا اور۔ پھر سر کھجانے لگا۔
ہے بھگوان! اقبال جرم کے بعد بھی وہی معصومیت،
وہی ضمیر کی آواز کی لعنت سے آزاد آتما۔ دیکھو تو سور کو
کس طرح آنکھ ملائے بیباکی سے تنا کھڑا ہے۔!!

آ

دنیا کا چوتھا طویل ترین

معلق پُل

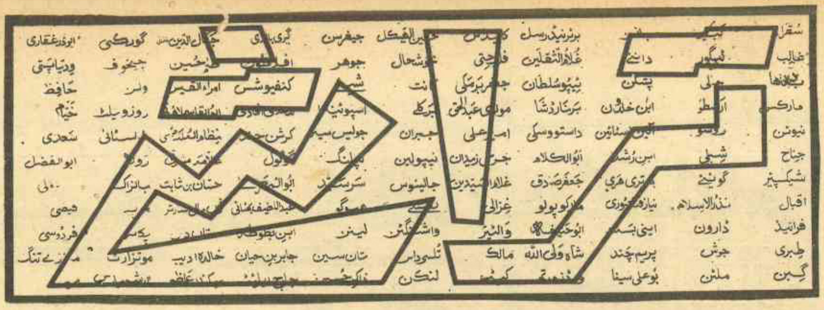


ملکہ ایلزبتھ ثانی نے ۴ر دسمبر کو اسکاٹ لینڈ میں سرکاری طور پر دنیا کے چوتھے طویل ترین معلق پل کا افتتاح کیا۔ مغربی ساحل پر سمندر کی عظیم آبنائے، فرث آف فورتھ کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ یہ پل یورپ میں اپنی نوعیت کا طویل ترین پل ہے۔

یہ پل جدید انجنیری کا شاندار کارنامہ ہے اور اس کی تعمیر میں چھ سال اور ۲۶ کروڑ روپے صرف ہوئے ہیں سارے پل کا پھیلاؤ تین ہزار تین سو فیٹ طویل ہے۔ اور دو میناروں کے درمیان معلق فاصلہ تیرہ سو چالیس فیٹ ہے۔ اس طرح مجموعی لمبائی تقریباً ایک میل ہے۔ اس میں تعمیر شدہ راستے بھی شامل ہیں۔

دونوں مینار ۵۱۲ فیٹ طویل ہیں اور ان کے ارد گرد فولادی تار کے رسے لگے ہوئے ہیں۔ جن میں پل کا عرشہ معلق ہے۔ یہ رسہ تقریباً بارہ ہزار پتلے پتلے تاروں کو مربوط کر کے بنایا گیا ہے۔ تمام تار کی لمبائی تقریباً ۳۰۰۰۰ ہزار میل ہے جو خط استوا کے مقام پر اس کرۂ ارض کے گرد فاصلے سے سوا گنا زیادہ ہے۔

پل پر موٹر گاڑیوں کے لئے چار راستے ہیں۔ اور یہ اس طرح بنایا گیا ہے کہ ہر سال ایک کروڑ دس لاکھ گاڑیاں اس پر گذر سکتی ہیں۔ سائیکل چلانے والوں اور پیدل چلنے والوں کے لئے علیحدہ خصوصی راستے بنائے گئے ہیں۔



جب تک ایک انسان دوسرے انسان کی پیٹھ پر سوار ہے اس وقت دنیا میں امن و امان محض ایک خوبصورت خواب ہی رہے گا ——— ویکونے

تونگروں کے ساتھ عالموں اور زاہدوں کی دوستی ریاکاری کی دلیل ہے ——— عثمانؓ

تمام جائدادیں اور جاگیریں چوری اور ڈاکہ زنی کا نتیجہ ہیں - یہ ضروری نہیں کہ یہ ڈاکہ جائداد کے موجودہ مالک نے ڈالا ہو - یہ کام اس کے باپ دادا، پردادا یا دس، بیس پشتوں تک کے آبا و اجداد کا بھی ہو سکتا ہے ——— پرودھن

غلام ملکوں میں ہر مسئلہ سیاسی صورت اختیار کر لیتا ہے ——— برنارڈ شا

طوفان تو سمندروں میں ہی آتے ہیں تالابوں کو کھنگالا جائے تو اس میں سے مہلک بدبو ہی پھوٹے گی ——— فلائبر

موت کسی کو شہادت کا درجہ نہیں دیتی تاوقتیکہ وہ کسی اصول یا نصب العین کی خاطر اپنی جان قربان نہ کر دے ——— چھبیلداس

اخبار نویس قوموں کا اتالیق، ناصح، مشفق اور پیٹھ پر کوڑا جمانے والا رہبر ہوتا ہے - مجھے تو ایک ہزار مسلح سپاہیوں سے اس قدر ڈر نہیں ہوتا جس قدر کہ چار مخالف اخبار نویسوں سے ——— نپولین

منطق سچائی کا نچوڑ ہے - اور سچائی دنیا کی سب سے طاقت ور شے ہے، اس لئے مطلق العنان اور غیر ذمہ دار حکمران ہمیشہ سچائی سے نفرت کرتے ہیں اور منطق کا گلا دبا دیتے ہیں ——— کوزے

اگر عاجزی اور انکساری ہی کا نام عبادت ہے تو ذلت پر قانع گدھے سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہیں ——— معرّیؒ

گناہ کے آغاز میں اتنی لذت نہیں - جتنی اس کے اختتام میں تلخی ہے ——— ملایائی کہاوت

بھوکے عوام کو سیاسی آزادی کی بڑی سے بڑی مقدار بھی مطمئن نہیں کر سکتی ——— لینن

چراغ اپنا ہی خون پیتا ہے - وہ تاریکی کو کھاتا ہے اور پھر اسے کاجل کی شکل میں تھوکتا ہے - عمل کے بطن میں اسکے نتائج پوشیدہ ہوتے ہیں ——— قاضی عبدالغفار

بھوک اور افلاس کی وجہ پیداوار کی کمی نہیں بلکہ اسکی غلط تقسیم ہے ——— آرنلڈ

ایک فرد کو تعلیم دے کر آپ صرف ایک فرد کو تعلیم دیتے ہیں - ایک عورت کو تعلیم دے کر آپ ایک کنبہ کو تعلیم یافتہ بناتے ہیں ——— میکلور

اپنی توہین و تذلیل اپنی زبان سے کبھی نہ کیجئے اس موضوع پر بولنے کا حق آپ کے دوست ادا کریں گے ——— ٹیلی رینڈ

ہمارے ہاں بھونڈے شاعروں کی بڑی تعداد کی وجہ یہ ہے کہ وہ سب الہامی شاعر ہیں ——— چیٹرٹن

وہ دوزخ جس میں قاعدۂ مساوات ہو اس جنت سے بہتر ہے جس میں تفریق درجات ہو ——— ملٹن

فن برائے فن کے تصور سے حیات انسانی کی تاریخ بالکل نا آشنا ہے ہر زمانے کا فن اس زندگی کی بدولت زندہ رہا ہے جس کے نقش اس نے پیش کئے ہیں فن ہمیشہ ایک مخصوص معاشرے کے بطن سے پیدا ہوا اور فن کا سرچشمہ ارضی اور مادی زندگی ہے ——— مجنوں گورکھپوری

سرمایہ دارانہ پارلیمنٹ یا جیسے عام طور سے جمہوری حکومت کے نام سے پکارا جاتا ہے دراصل کیا ہے؟ ہر تیسرے چوتھے پانچویں یا ساتویں سال غریب اور بے کس عوام سے یہ دریافت کرنے کی گستاخی کرنا کہ سرمایہ داروں میں سے کون فرد تم پر حکومت کرے اور تمہیں لوٹ کھسوٹ کا نشانہ بنایا کرے ——— کارل مارکس

جب میں عورتوں کو پردے میں بند (بیرونی دنیا سے الگ تھلگ) دیکھتا ہوں تو فوراً ہی میرے دل میں جیل خانے کا یا چڑیا گھر کا خیال آجاتا ہے - کوئی قوم اپنی نصف آبادی کو قید خانے میں ڈال کر ترقی کی امید کس طرح کر سکتی ہے ——— جواہر لال نہرو

ہر شخص کو اپنے ڈھنگ اور طریقے کے مطابق بہشت حاصل کرنے کی اجازت ہونی چاہئے ——— فریڈرک

غصہ تھوڑی دیر کی اور غرور ہمیشہ کی دیوانگی ہے ——— کوپر

قسم کھانا قابل نفرت اور فریب دہ رسم ہے ——— واشنگٹن

میرے عمل کو تو میرے ملک کے حکمرانوں کے قوانین محدود کر سکتے ہیں مگر میرے خیالات کی پرواز کی کوئی حد نہیں ——— فاسٹو

سب سے پرکشش سمندر وہ ہے جسے ہم میں سے کسی نے دیکھا نہیں، سب سے حسین دن وہ ہیں جو ابھی ہم نے گزارے نہیں، سب سے پیاری باتیں وہ ہیں جنہیں میرے ہونٹ ابھی تک تم سے نہ کہہ پائے ——— ناظم حکمت

زندگی ایک غیر ملکی زبان ہے جس کا تلفظ ہر شخص غلط کرتا ہے ——— کرسٹوفر مورے

علی ناصر زیدی



ہوابازی

کٹی ہاک (شمالی کیرولینا) کے ویران ریگستان پر ولبر آدر اورول رائٹ نے ۱۷ دسمبر ۱۹۰۳ء کو انسان کے ایک قدیم خواب کو سچ کر دکھایا۔ انھوں نے۔ لکڑی۔ کپڑے۔ تاروں اور سائکل کی زنجیروں سے جکڑی جکڑائی ایک عجیب وغریب مشین جس میں ۱۲ ہارس پاور کا انجن لگا ہوا تھا ہوا میں اڑائی۔ اس نے ۱۲ سیکنڈ میں ایک سو بیس فٹ کا فاصلہ طے کیا یہ تھی دنیا کی پہلی ہوا سے بھاری مشین جس نے ہوابازی کا آغاز کیا۔ تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک مشین جس میں ایک انسان بھی موجود تھا اپنی قوت سے ہوا میں اٹھی اور رفتار کم کئے بغیر اڑی۔ اس کے بعد وہ اسی میدان میں سہولت سے اتر بھی گئی۔

انسان صدیوں سے اس فکر میں تھا کہ چڑیوں کی طرح پرواز کرے کہا جاتا ہے کہ سکندر اعظم نے بھی اڑنے کا بندوبست کیا تھا اس نے دو مضبوط عقابوں پر ایک جوا رکھا اور خود اس پر سوار ہو گیا۔ اس نے ہاتھ میں ایک نیزہ سنبھالا جس کی انی پر گوشت کا ایک ٹکڑا لگا ہوا تھا۔ سکندر جس سمت میں انی کر دیتا شکرے اسی سمت میں اڑنے لگتے تھے!

پندرھویں صدی کا مشہور مصوّر اور مجسمہ ساز لیونارڈو ڈاونسی انجینئر اور موجد بھی تھا۔ اس نے پرواز کے مسئلہ کی طرف بھی توجہ دی چڑیوں کو پھڑپھڑاتے دیکھ کر اس نے کئی ایسی مشینیں بنائیں جن کے بازو اسی طرح حرکت کرتے تھے۔ اس نے گھومنے والے بازو کی تجویز بھی پیش کی تھی جو آج ہمارے ہیلی کوپٹروں میں نظر آتے ہیں۔ لیونارڈو کو "ہوا پیچاں"[۱] کا موجد بھی کہا جاتا ہے۔ جو مشین کو ہوا میں کھینچ سکے۔ اس طرح جدید دھکیلو پنکھا ایجاد ہوا۔

لیونارڈو نے ہی سب سے پہلے ہوابازی کی بنیادی مسائل کا جائزہ لیا۔ چڑیوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ وزن اور بازوؤں کے پھیلاؤ میں براہ راست ایک نسبت موجود ہے۔ جس کے مطابق انسان کو ہوا میں اڑنے کیلئے بارہ فیٹ پھیلاؤ کی ضرورت پڑے گی۔ لیونارڈو کے اندازے ان بدقسمت موجدوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ صحیح تھے جو اس کے بعد اس میدان میں اترے۔

اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ لیونارڈو کی کسی بھی مشین نے کامیابی سے پرواز کی ہو۔ یا اس کے نظریات کا کوئی اثر ہوابازی کے ارتقا پر پڑا ہو ۱۹۳۰ء سے پہلے اس کے کارنامے شائع بھی نہیں ہوئے تھے۔ جس شخص کے نظریات نے ہوابازی پر اثر ڈالا وہ سر جارج کیلے نامی ایک انگریز سائنس داں تھا ۱۸۰۹ء میں اس نے ہوابازی کے موضوع پر بڑا عمدہ بیان دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ کوئی چیز اس وقت تک پرواز نہیں کر سکتی جب تک ہم ہوا کی مزاحمت پر طاقت کا اطلاق نہ کریں۔ کیلے کا مقصد یہ کہنا تھا کہ:

۱:۔ چیز کو سنبھالنے کے لئے کوئی سطح ہو۔ (موجودہ طیارے کے بازو۔)

۲:۔ طاقت (موٹر اور دھکیلو پنکھے جو طیارے کے بازوؤں کو ہوا میں کھینچتے ہیں)

۳:۔ خود ہوا (جیسا کہ آپ آگے پڑھیں گے "ہوا کی مزاحمت" بازووں کو "اٹھانے" کی قوت دیتی ہے پورا طیارہ کشش ثقل پر حاوی ہو کر اوپر اٹھ جاتا ہے)

کیلے نے غیر متحرک بازوؤں کا تصور پیش کیا ورنہ اس سے قبل تمام موجد پھڑپھڑانے والے بازووں پر زور دیتے رہے۔ اپنے نظریات کو جانچنے کے لئے اس نے گلائڈروں کے نمونوں پر بہت سے تجربات کئے۔

ہوابازی کے ارتقاء میں ان تجربات کی بڑی اہمیت ہے۔ تیل کے بغیر چلنے والے ان طیاروں نے آنے والی مشینوں کی شکل وصورت بہتر بنائی اور وہ اس قابل ہوئیں کہ ہوا میں اڑ سکیں۔ اوٹو للنتھال نے سب سے پہلے ایسے طیاروں کے خاکے بنائے جو انسان کو ہوا میں لے جا سکتے تھے۔ اس نے بازوؤں میں خم پیدا کیا اپنی کتاب[۲] میں خم دار بازوؤں کے متعلق اس نے لکھا ہے "ہوابازی کا راز ان بازووں میں ہی پنہاں ہے"

للنتھال نے دو ہزار سے زیادہ گلائڈر بنائے اور اڑائے جن میں سے بعض نے ۲۰۰ سے ۳۰۰ گز تک کا فاصلہ طے کیا۔

ہم آگے چل کر بیان کریں گے کہ ہوائی جہاز کیسے اڑتا ہے۔ آیئے اس سے قبل ایک اور چیز کا ذکر یں۔ جو ہوابازی کی تاریخ میں کافی اہمیت رکھتی ہے یعنی غبارہ۔

غبّارے

جون ۱۷۸۳ء میں ایٹین اور جوزف مونٹ گولفر نامی فرانسیسی بھائیوں نے ایک غبارہ بنایا جس میں انھوں نے ۶۰۰۰ فیٹ کی بلندی پر ایک میل تک پرواز کی۔ یہ غبارہ کاغذ کا بنا ہوا تھا اور اس میں ململ کا استر لگایا گیا تھا۔ غبارے میں گرم ہوا بھر دی گئی تھی۔ چونکہ گرم ہوا ٹھنڈی ہوا کے مقابلے میں کم کثیف ہوتی ہے اس لئے غبارے کو اٹھنے میں آسانی رہی ساتھ ہی وہ گنڈولا بھی اٹھ گیا جس میں یہ لوگ بیٹھے تھے۔ اور جو غبارے سے بندھا ہوا تھا۔

مونٹ گولفر برادران نے غباروں کا طویل سلسلہ شروع کر دیا۔ میلوں ٹھیلوں میں یہ پروازیں تفریح کا سامان مہیا کرنے لگیں۔ لکڑیاں جلا کر کھونٹوں کی مدد سے غبارے کو ان پر باندھ دیا جاتا تھا تاآنکہ اس میں گرم ہوا بھر جاتی تھی اس کے بعد ایک آدمی جھولے میں بیٹھ جاتا جسے غبارے میں باندھ دیا جاتا تھا۔ جب غبارہ چھوٹتا تھا تو وہ ایک شور کے ساتھ ہوا سے باتیں کرنے لگتا تھا اور جب زیادہ سے زیادہ بلندی حاصل کر لیتا تھا تو جرأت مند غبارہ باز ایک رسی کھینچ کر پیراشوٹ کے ذریعے نیچے اتر آتا تھا۔ غبارہ چلتا پھرتا دور نکل جاتا تھا اور جب اس کی ہوا ختم ہو جاتی تھی تو وہ کسی میدان

"THE ART OF FLYING BASED ON THE FLIGHT OF BIRDS" ۲ - AIR SCREW ۱



دوران پرواز تیل بھرا جا رہا ہے

یا سمندر یا سبزہ زار میں گرجاتا تھا جہاں سے اسے اٹھالیا جاتا تھا۔

بعد میں ہوا کی بجائے ہائڈروجن استعمال کی جانے لگی ہائڈروجن سب سے ہلکی گیس ہوتی ہے۔ ہائڈروجن کی مدد سے ۱۸۶۲ء میں کوکسویل اور گلیشر نامی دو غبارے باز سات میل کی اونچائی تک پہنچے۔

غباروں پر قابو نہیں رہتا تھا۔ لہٰذا آمد و رفت یا رسل و رسائل کے لئے وہ کبھی موزوں ذریعہ ثابت نہ ہو سکے ہاں یہ پروازیں ولولہ انگیز ضرور ثابت ہوئیں۔ ایک غبارہ باز ہوا میں اتنی دیر ٹھہرا رہا کہ تیز ہواؤں نے اسے پیرس سے دو ہزار میل دور ماسکو تک پہنچا دیا۔ رفتہ رفتہ رخ موڑنے والے آلات، اندرونی احتراقی انجن اور دھکیلو پنکھے وغیرہ ایجاد ہوئے تب کہیں ہوا سے ہلکی مشین تیار ہوئی یہ تھا پہلا ایرشپ یا طیارہ۔ زیپلین کا نام ابھی تک مشہور ہے یہ طیارے بہت سے بھاری سامان اور مسافر اٹھا سکتے تھے

ہوا سے ہلکے یہ طیارے فوجی ضروریات پوری کرنے اور اشتہارات لے جانے کے لئے اب بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ لیکن دوسرے مقاصد کے لئے ان کا استعمال متروک ہو چکا ہے۔ کیونکہ اب ایسے طاقتور طیارے بن چکے ہیں جو ۳۰۰ سے زائد مسافر یا ۳۵ ٹن سامان لے جا سکتے ہیں۔

ہوائی جہاز کیسے اڑتا ہے؟

ہوا ہماری دنیا میں اسی طرح موجود ہے جس طرح پانی یا مٹی۔ پیراشوٹ ہوا بھر جانے کی وجہ سے۔ آہستہ آہستہ نیچے گرتا ہے اسکی اندرونی سطح پر بے شمار سالمات اثر انداز ہوتے ہیں اور اسے تیزی سے نیچے نہیں گرنے دیتے۔ لیکن اگر پیراشوٹ وقت پر نہ کھل سکے تو وہ تیزی سے نیچے گر جاتا ہے۔

پتنگ کا اثر:۔

چونکہ ہوا مادے کی ایک شکل ہے لہٰذا جب بھی کوئی چیز اس سے گزرتی ہے۔ وہ مزاحمت کرتی ہے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ متوازی الارض اڑنے والی چیزوں کی راہ میں وہ رکاوٹ ڈالتی ہے لیکن ایک سادہ تجربہ ثابت کر دے گا کہ یہ مزاحمت بھی کارآمد ہو سکتی ہے بارہ انچ لمبا اور نو انچ چوڑا کاغذ کا ایک تختہ لیجئے۔ اور اس کا ایک سرا اس طرح پکڑیئے کہ آپکی انگشت شہادت اوپر رہے۔ اور انگوٹھا اور بیچ کی انگلی نیچے آجائے اسے خم دے کر سنبھال لیجئے تاکہ وہ نیچے گرنے نہ پائے۔ جو سرا ہاتھ میں ہے اسے نیچے رہنے دیجئے اور دوسرا سرا ذرا اوپر کر دیجئے۔ اب اسے پکڑے پکڑے آگے کی طرف دھکیلئے۔ آپ دیکھیں گے کہ دوسرا سرا خود بخود اوپر اٹھ جائے گا۔ کیوں؟

جب کاغذ کی سطح ہوا کی سالمات سے رگڑ کھاتی ہے تو یہ سالمات ایک جگہ جمع ہو جاتی ہے۔ وہ بھی کاغذ کو دھکا دیتے ہیں۔ اس مزاحمت کا کچھ حصہ کاغذ کو آگے بڑھنے سے روکتا ہے۔ لیکن چونکہ جمع شدہ سالمات ہر چہار اطراف میں کاغذ پر اثر، ڈالتے ہیں اس لئے تھوڑی سی مزاحمت کاغذ اٹھانے میں صرف ہو جاتی ہے اور اس کا دوسرا سرا اوپر چلا جاتا ہے۔ تھوڑی سی مشق کے بعد آپ کاغذ یا گتے کو رگڑ کر اوپر اٹھا سکتے ہیں۔ جب آپ ہاتھ ہٹائیں گے تو کاغذ خود بخود اوپر اٹھتا چلا آئے گا۔

کاغذ کے اس تختے کی مثال ہوائی جہاز کے بازو جیسی ہے ہوا سے بھاری پرواز کے سلسلہ کیلئے کو بھی ایسی ہی چیزوں کی ضرورت پڑی تھی۔ آپ نے ہوا کی مزاحمت پر قوت (اپنے ہاتھ کے ذریعہ) صرف کی اور اس طرح آپ کو تھوڑی سی "اٹھان" مل گئی۔

آپ دیکھ چکے ہیں کہ جب کوئی ترچھی سطح ہوا کے خلاف حرکت کرتی ہے تو ہوا اسے پیچھے کی طرف دھکیلتی ہے جس سے کچھ تو اسکی رفتار کم ہو جاتی ہے اور کچھ وہ اوپر اٹھ جاتی ہے۔ پتنگ بھی اسی وجہ سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہوا اسکی سطح سے متصادم ہو کر اسے دباتی ہے۔

"خلائی" اثر:۔

اب کوئی اصل ہوائی جہاز دیکھئے اور اس کے چپٹے خم دار حصہ کا مشاہدہ کیجئے جو ہوا کو دباتا ہے ہماری مراد ہوائی جہاز کے بازوؤں سے ہے۔ ان کی شکل ایسی رکھی جاتی ہے کہ سامنے کا سرا پیچھے کے سرے سے قدرے بلند ہوتا ہے بازوؤں کے اوپر کی سطح خمیدہ ہوتی ہے، صرف نچلی سطح چپٹی ہوتی ہے۔ کیوں؟ — اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے ایک اور تجربہ کیجئے کاغذ کی چھ انچ لمبی اور دو انچ چوڑی ایک دھجی لیجئے اس کا سرا اپنے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے بیچ میں دبایئے۔ انگوٹھا اوپر رہنا چاہیئے تاکہ جب وہ گرے تو اسکی شکل بہت کچھ ہوائی جہاز کے بازو کی بالائی سطح جیسی ہو جائے۔ اب کاغذ کو ہوا میں تیزی سے کھینچئے۔ پہلے تجربہ کی طرح اس کا دوسرا سرا اوپر اٹھ جائے گا۔ کیونکہ ہوا نیچے سے زور لگاتی ہے یہ بات ہے تو درست لیکن ابھی مکمل نہیں ہوئی — بالائی سطح کا عمل سمجھنے کے لئے اپنی انگلیاں اور کاغذ اپنے ہونٹ کے نیچے لایئے اور اسکی صرف بالائی سطح پر پھونک ماریئے۔ کاغذ پھر اٹھ جائے گا۔

کیوں ہے؟

ہم پھر کہتے ہیں کہ ہوا کا وجود ہے اور اس میں بے شمار سالمات ہوتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ سالمات ہر وقت حرکت میں رہتے ہیں۔ اس لئے ہوا جب ساکن ہو جاتی ہے تب بھی تمام اطراف میں۔ اوپر، نیچے اور ادھر ادھر۔ دباؤ ڈالتی رہتی ہے سطح سمندر پر یہ دباؤ پندرہ پونڈ فی مربع انچ کے قریب ہوتا ہے۔ جب کوئی ہوائی جہاز زمین پر کھڑا ہو تو اس کے بازو پر پڑنے والا دباؤ بازوؤں کی نچلی سطح پر پڑنے والے دباؤ کی وجہ سے بے اثر ہو جاتا ہے۔ لیکن جب ہوائی جہاز حرکت کر رہا ہو تو دلچسپ نتیجہ نکلتا ہے۔ بالائی سطح کا رقبہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس پر پھیلنے والی ہوا کی رفتار نچلی سطح پر چلنے والی ہوا سے زیادہ ہوتی ہے بالائی ہوا کی کچھ قوت پھر تیز رفتاری کی وجہ سے ضائع ہو جاتی ہے اس لئے اس کا دباؤ قدرے کم ہو جاتا ہے اس طرح بازوؤں کی بالائی سطح کا دباؤ کم ہو کر وہاں جزوی خلاء پیدا کر دیتا ہے نیچے کا دباؤ بازو کو اوپر اٹھا دیتا ہے اور پورا طیارہ اوپر چلا جاتا ہے۔

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ متحرک بازو کو اٹھانے کے لئے دو عوامل ذمہ دار ہیں۔

۱:- بازو کی نچلی سطح پر ہوا کا تصادم ("پتنگی" اثر)۔

۲:- بازو کی بالائی سطح پر ہوائی دباؤ کی کمی۔ (خلائی اثر)

ان دو عوامل میں دوسرا زیادہ اہم ہے۔ بازو کو اوپر اٹھانے میں اس کا اسی فیصد حصّہ ہے۔

پنکھے کا کام:-

آپ کے کاغذی بازو کو اوپر اٹھانے کے لئے، مطلوبہ قوت خود آپ کے جسم نے صرف کی۔ ہوائی جہاز میں یہ قوت انجن سے حاصل ہوتی ہے اور ایک دُھرے کے ذریعہ پتوار (دھکیلو پنکھے) کو منتقل ہو جاتی ہے۔ جسے بعض اوقات "ایئر سکرو" کہا جاتا ہے دھکیلو پنکھا برقی پنکھے سے ملتا جلتا ہے اس کے پنکھوں کو موڑ کر ایسی شکل دی جاتی ہے کہ وہ ہوا دھکیلتے رہیں۔ پیچھے کی ہوا اس عمل میں مزاحمت کرتی ہے اور پنکھوں کو آگے کی طرف دھکیلتی ہے۔ چونکہ پتوار (دھکیلو پنکھا) طیارے سے جڑا ہوتا ہے۔ اس لئے پورا طیارہ اتنی رفتار سے آگے بڑھتا ہے کہ بازو میں اٹھنے کا زور پیدا ہو جائے۔ پنکھوں کی سطح خم دار ہوتی ہے۔ لہٰذا سامنے کی ہوا کا دباؤ پیچھے کی ہوا کے بمقابلہ کم ہو جاتا ہے اس تعارف سے ظاہر ہے کہ دھکیلو پنکھا بھی بازو کی طرح عمل کرتا ہے۔ اور ہوا پر اثر ڈال کر اپنے لئے قوت فراہم کرتا ہے۔

(باقی باقی)

تابؔ اسلم

توڑ کے پتھر کی دیواریں اک دن دل سے باہر آؤ
اے میری بیکل امیدو اے میری گھائل آشاؤ

ایک ہی غم جو ڈھلتا جائے زہر کی صورت شریانوں میں
لیکن اپنے اپنے آنسو لیکن اپنے اپنے گھاؤ

رات کے گہرے سناٹے میں دیتے ہو کس کو آوازیں
جاگنے والو کون آئے گا جاگنے والو سو بھی جاؤ!

اے چلمن سے چوری چوری جھانکنے والی سندر آنکھو
روح تو صدیوں سے پیاسی ہے آکر اسکی پیاس بجھاؤ

ایک ہی جادو، ایک ہی خوشبو، ایک ہی سپنا ایک ہی سایا
منزل منزل اس کو ڈھونڈو منزل منزل ٹھوکر کھاؤ

کون کسی کے غم بانٹے گا، کون کسی کے ساتھ چلے گا
اپنے اپنے آنسو پونچھو، اپنا اپنا بوجھ اٹھاؤ

تابؔ اگر معراجِ وفا کی تم کو بھی حسرت ہے دل میں
کاغذ کے کچھ پھول سجا کر بھڑکے ہوئے شعلوں میں جلاؤ



انٹرویو — ۳

محمد یامین

خالد حمیدی
افتخار جبیل

ایک شخصیت ——— ایک خاکہ —

اس دفعہ یامین صاحب کا انٹرویو لینے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ ہمارے ذہن میں ان کا وہ ہیولا تھا جو برنس گارڈن کے پیچھے واقع کے، ای، ایس، سی ایمپلائز یونین کے دفتر میں ہونے والے مزدور انجمنوں کی رابطہ کمیٹی کے جلسوں میں

جوش اور جذبہ سے بھرے ہوئے مقرر کا تھا۔
"ہمیں سرمایہ داروں اور انکے ایجنٹوں کا اپنی متحدہ طاقت سے مقابلہ کرنا ہے۔

تمباکو کمپنی کے ملازمین کی ہڑتال کو کامیاب بنانے کے لئے کسی قربانی سے دریغ نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ قانونی ہڑتال ہے

یہ مزدوروں کی روٹی روزگار کی جدوجہد کا آئینی ذریعہ ہے۔ اگر ہمیں اس میں ناکامی ہوئی تو یہ ہماری تنظیم کی ناکامی ہوگی۔ یہ ہمارے اتحاد کی ناکامی ہوگی"

کم وبیش یہی الفاظ تھے جنکی یاد کے ساتھ ساتھ یاسین صاحب کے خشک اور بکھرے ہوئے بال، مضبوط جبڑے بھنچے ہوئے دانت شعلہ بار آنکھیں، کشادہ پیشانی۔ چوڑا چکلا سینہ اور تنی ہوئی مٹھیاں بھی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔

ہم لوگ سیکورٹی پرنٹنگ پریس کی یونین کے دفتر تقریباً ساڑھے چار بجے پہنچ گئے تھے۔ لیکن اس وقت دفتر کے دروازے پر بڑا سا تالا لٹکا ہوا ہمارا منہ چڑا رہا تھا ہم پہلی دفعہ یہاں آئے تھے۔ دفتر ڈھونڈنے میں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑا اور اب جتنی کوفت ہوئی بتا نہیں سکتے۔ جی تو یہی چاہا کہ واپس چلے جائیں دن بھر آفس میں سر کھپانے کے بعد انتظار کی کٹھن گھڑیاں گزارنا تو اور بھی مشکل ہو جاتا ہے ـــ لیکن ہمیں بہرحال انتظار کرنا تھا۔ ہم دونوں آفس سے ملحقہ چائے کی دکان پر دھرنا دے کر بیٹھ گئے ـــ باتیں کرتے رہے یہی آفس کی، اپنی یونین کی "منشور" کی ـــ باتوں ہی باتوں میں یہ بات بھی نکل آئی کہ آج ہم دونوں جس

شخص کا انٹرویو لینے آئے ہیں وہ مزدوروں میں کافی مقبول اور ہر دلعزیز سہی پھر بھی ابھی تک کسی نے اسکی شخصیت، اسکی زندگی اور اس کے کارناموں کو سپردِ قلم نہیں کیا ـــ ہمارے

ماحول، ہمارے معاشرے میں یہ اتنا ہی غیر اہم ہے جتنا کہ اور دوسرے مزدور۔ یہ المیہ دراصل ہمارے پورے سماج کا ہے۔ یہ المیہ ہمارے اس نظام کا ہے جس میں شخصیت انکی ہی تسلیم کی جاتی ہے جن کے پاس دولت ہو جو خوش پوش ہو بڑے عہدوں پر قابض ہوں۔ یونیورسٹیوں میں پڑھ لکھ چکے ہوں اور جو اپنی اصلیت اور سادگی گنوا کر ملمع کی چکاچوند میں چھپے ہوئے ہوں ـــ یہاں محنت کرنے والے، محنت کشوں کو منظم کرنے والے، انکے حقوق کے لئے کال کوٹھری میں سڑنے والے، اور اجتماعی بھلائی اور مفاد کے لئے اپنی ذات کو تج دینے والے افراد کی کوئی حقیقت نہیں۔ کوئی اہمیت نہیں ـــ

ہم یہی باتیں کر رہے تھے کہ یاسین صاحب ایک ہاتھ میں فائل دبائے سامنے سے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ہماری طرف آتے نظر آئے انکے ساتھ انکی یونین کے دوسرے کارکن بھی تھے۔ انھوں نے ہمیں دیکھ کر دور ہی سے ہاتھ ہلایا اور ہمارے قلب کو سکون ملا کہ اتنی دیر صرف آدھ گھنٹے انتظار کر کے اگر یاسین جیسے مصروف اور سرگرم شخص سے ملاقات

ہو جائے تو ٹھیک ہی ہے اور خصوصاً موجودہ ہنگامی دور میں جبکہ پاکستان سیکورٹی پریس کی انتظامیہ نے انھیں معطل کر رکھا ہے۔

"بھائی ہمیں کچھ دیر ہو گئی"۔ یاسین صاحب نے فائل بائیں ہاتھ میں لیکر داہنا ہاتھ خالد حمیدی کی طرف بڑھا دیا ـــ "پرنٹنگ پریس کے ساتھی مانتے ہی نہیں۔ روزانہ مینجمنٹ کی دھاندلی کے خلاف مظاہرے کر رہے ہیں"۔ ان کا ہاتھ اب میرے ہاتھ میں تھا

جس کے دباؤ میں ایک خلوص، ایک پیار، ایک سختی اور ایک مضبوطی سی تھی۔ یاسین صاحب آفس میں داخل ہو کر میز کے سامنے بچھی ہوئی کرسیوں پر ہمیں بٹھاتے ہوئے بولے۔

"بھائی معاف کیجئے گا ـــ ذرا میں اس کام سے فارغ ہو لوں"۔ اور پھر اگلے آدھ گھنٹے تک وہ ایک فائل کو دیکھتے رہے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے ساتھیوں سے تازہ ترین صورت حال پر تبادلہ خیال کرتے رہے آخر وہ انتظار کی گھڑیاں بھی ختم ہو گئیں۔ اور یاسین صاحب اپنی میز سے اٹھ کر ہمارے قریب آبیٹھے۔

"چائے تو چلے گی"۔ انکے لہجہ میں بے تکلفی تھی۔ اور انکے چہرے پر پیاری سی مسکراہٹ ـــــ

"کیوں نہیں" افتخار جلیل نے جواب دیا۔

"بھئی صورت حال یہ ہے کہ ہماری انتظامیہ نے ایسے مسائل پیدا کر دیئے ہیں جنکی وجہ سے صرف ہمیں ہی پریشانی نہیں ہے بلکہ خود اسکے لئے بھی نظم وضبط قائم رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ یاسین صاحب سب کچھ کہہ ڈالتے کہ حمیدی نے مسکراتے ہوئے انھیں ٹوکا۔

"لیکن ذرا چائے تو ہو جائے" جملہ ختم ہوتے ہی چائے آگئی۔

اور پھر ہم چائے پیتے رہے۔ گرم گرم چائے حلق سے اتری تو، رگوں میں خون کی گردش تیز سی ہوئی۔ انتظار کی بوریت دور ہوئی باقاعدہ گفتگو کا آغاز ہوا۔

"آپ اپنے بچپن کے قابل ذکر واقعات بتایئے ـــ دلچسپ اور شرارتوں سے بھرپور تاکہ ابتداء تو پر تفریح انداز سے ہو جائے"۔

"میں عام بچوں جیسا تھا ـــ پڑھائی میں تو تیز نہ پھسڈی ـــ کوئی خاص شرارت میرے نامۂ اعمال میں نہیں"۔ وہ رک گئے تو افتخار نے اصرار کیا۔

"آخر کچھ نہ کچھ تو ہو گا ہی"۔

"نہیں ـــ کچھ بھی نہیں ـــ بچپن بالکل سپاٹ گزرا"۔

"اچھا تو پھر اپنے خاندانی حالات ہی بتایئے"۔ افتخار نے ہار مان ہی لی۔

"میں ۲۹ فروری ۱۹۲۸ء کو بریلی میں پیدا ہوا"۔ یاسین صاحب نے کہنا شروع کیا۔ "میں ایک متوسط خاندان کا فرد ہوں۔ میرے والد کا گوٹا بنانے کا کارخانہ تھا بیوہ اور دوسری

ضرورتمند عورتیں اس کام کو ہمارے گھر پر ہی آ کر مزدوری پر کرتیں لیکن جب مشین آگئیں تو یہ کام مندہ پڑ گیا اور آخر بالکل ہی ٹھپ ہو گیا۔ میں نے مڈل تک پڑھا۔ بڑے بھائی مجھے ٹیچر بنانا چاہتے تھے۔ مگر میرا ذہن شروع سے ہی یبالت کی طرف مائل تھا۔ انگریزی نہ پڑھی کہ انگریزوں سے سخت نفرت تھی۔ والد نے ایک حکیم کے ساتھ کام سیکھنے کے لئے بٹھا دیا۔ کچھ دنوں میں ذمہ داری کا احساس دلانے کے لئے میری تنخواہ ۲ پیسہ روز مقرر ہوئی۔ پہلی بار جب ہمیں تنخواہ ملی"۔ یاسین صاحب کے چہرہ پر ایک بھولی سی مسکراہٹ تھی۔ "تو ہم نے بہت مذاق اڑایا۔ حکیم صاحب نے بید لے کر ہماری پٹائی شروع کر دی"۔ یہ کہتے ہوئے یاسین صاحب غیر ارادی طور پر اپنی ہتھیلیوں کو دیکھنے لگے "وہاں کام ختم ہو گیا ۱۹۴۶ء میں ٹرنر کی حیثیت سے بریلی کے پاور ہاؤس میں باقاعدہ ملازمت شروع کی۔ میری اس ملازمت کا آغاز بھی عجیب حالت میں ہوا۔ پاور ہاؤس کی یونین نے اس زمانے میں اسٹرائیک کا نوٹس دے رکھا تھا اور میرے لئے ایک مسئلہ بن گیا تھا کہ میں ہڑتال میں حصہ لے کر اس نوکری کو خطرے میں ڈالوں یا نوکری بچانے کی خاطر مزدوروں سے غداری کروں"۔ انھوں نے بتایا کہ کافی سوچ بچار کے بعد انھوں نے ہڑتال میں شریک ہونے کا فیصلہ کر ڈالا۔ لیکن یہ ہڑتال ہوئی نہیں۔ کیونکہ حکومت نے کمیشن مقرر کر دیا تھا۔ یاسین صاحب کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے۔

"اسی زمانے میں مجھے پہلی بار یہ تجربہ ہوا کہ لوگوں کے مذہبی جذبات کو ابھار کر مزدور تحریک کو کس طرح

کمزور کیا جاتا ہے۔ ہوا یہ کہ جس زمانے میں ہڑتال کا نوٹس دیا جا چکا تھا اور تمام مزدور ہڑتال کے لئے تیار ہو گئے تھے تو ایک مسلمان فورمین نے ہم تمام مسلمان ملازمین کی ایک میٹنگ اپنے گھر پر بلائی۔ کھانے پینے کا بھی خاصا معقول انتظام تھا۔ خاطر تواضع کے بعد میزبان موصوف حرف مطلب زبان پر لائے اور انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کو ہڑتال وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ کیونکہ اس طرح بڑی مشکل سے، ہم مسلمانوں کو ملنے والی نوکری خطرے میں پڑ جائیگی انھوں نے یہ بھی کہا کہ دراصل یہ ہندوؤں کی ایک سازش ہے جو اس لئے کی گئی ہے کہ اس کمپنی کے واحد مسلمان اعلیٰ عہدیدار عبدالرحمٰن ـــــــ

کو علیحدہ کر دیا جائے۔ یہ باتیں سن کر پورے ماحول پر سناٹا سا چھا گیا تھا۔ میں نیا نیا ضرور تھا لیکن یہ بات میرے دل کو نہ لگی۔ کچھ دیر تو میں دیکھتا رہا کہ کوئی اور بولے لیکن جب

کوئی نہ بولا تو میں نے اپنی جھجک کے باوجود خود ہی بولنے کا ارادہ کر لیا اور آخر کھڑا ہو ہی گیا میرے جملے کچھ بے ربط سے تھے لیکن مجھے یاد ہے کہ میں نے جو باتیں کہیں تھیں ان کا



ایک دعوت کے موقع پر مینیجنگ ڈائرکٹر محمد اسلم سے گفت و شنید

مطلب یہی تھا کہ مزدور اگر مذہب اور ملت اور ملک اور قوم کے خانوں میں بٹ گئے تو مزدور تحریک ختم ہو جائے گی اور پھر سرمایہ دار کمزور اور غیر منظم مزدوروں کے سروں پر سوار رہیں گے۔ میں اس تجویز کی مخالفت کرتا ہوں اور کچھ ایسے اقدام کی حمایت کروں گا۔

سب خاموش تھے۔ مگر اس خاموشی میں جب میری آواز گونجی، تو کتنی سی آوازیں میری حمایت میں بلند ہوئیں۔ اور عبدالرحمٰن ہماری صفوں میں پھوٹ ڈالنے کی سازش میں ناکام ہو گیا۔ یہ واقعہ میری زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے۔۔ اس کے بعد میں پوری سرگرمی کے ساتھ اپنی یونین میں کام کرنے لگا مجھے یونین کی مجلس عاملہ کا رکن چن لیا گیا۔ اور جہاں کہیں کوئی مزدور کانفرنس ہوئی تو مجھے بھی نمائندہ بنایا گیا اور اس طرح میں حقیقی معنی میں ایک مزدور کا رکن بنا۔

"اسی عرصہ میں ایک بار میں تیرہ گھنٹے تک زیر حراست رہا ہوا یوں کہ ملکی آزادی کے بعد حکومت نے مزدوروں کے مطالبہ پر یوم مئی کی چھٹی دینے کا اظہار کیا لیکن شرط یہ رکھی کہ اسکے بدلے پہلی مئی کے بعد آنے والے اتوار کو کام کیا جائے میں نے دوسرے مزدور ساتھیوں کے ساتھ اس شرط کو ماننے سے انکار کر دیا۔ یامین صاحب نے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے کہا ـــــ "کیوں بھئی اچھی تو نہ ہوئی اگر ایسا ہی ہے تو یکم مئی کو ہم کام کے بعد اپنے مزدور شہیدوں کی یاد منا سکتے تھے۔ یہ کوئی تہوار تو تھا نہیں ـــــ اس کے علاوہ ہم یہ بھی سوچ رہے تھے کہ جب ہم کام کریں گے تو یہ احساس ہمیں جھنجھوڑتا رہے گا کہ ابھی ان شہید مزدوروں کے خون کا احترام کرنے والوں کا زمانہ نہیں آیا ہے۔"

"بہرحال یہ تھا ہمارا نقطۂ نظر تو عبدالرحمٰن صاحب کو کھیل گیا جو اس زمانے میں ہماری یونین کے صدر بھی تھے لہٰذا انہوں نے مزدوروں کے اس فیصلے کو ماننے اور منوانے کے بجائے یونین ہی چھوڑ دی اور نتیجتاً مجھے تیرہ گھنٹے تک بطور انتقام سلاخوں کے پیچھے بھجوا دیا۔" "اور کچھ" حمیدی نے پوچھا "ایسے بناسپتی مزدور رہنما تو اور بھی ملے ہوں گے۔"

"ہاں بھئی ایک مزدور رہنما دربار ی لال شرما کا بھی ذکر کرتا چلوں" یامین صاحب بولے۔ "یہ کبھی تو مزدوروں کے رہنما ہوا کرتے تھے اور جب وزیر بن گئے تو مزدوروں اور کسانوں کی طرف سے ایسی آنکھیں پھیریں کہ جیسے انھیں کبھی جانتے ہی نہیں تھے۔ لیڈر رہنے مزدوروں کے نام سے اور کھیلے سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں۔ دراصل میں نے اس زمانے میں ہی محسوس کیا کہ آزادی کی پوری تحریک تقریباً ایسے ہی ہاتھوں میں تھی لیکن ہم کرتے بھی کیا اس وقت یہی نعرہ کافی تھا۔ "ہندوستان چھوڑ دو"۔ مگر آزادی حاصل کرنے کے بعد زیادہ دیر نہ لگی کہ پہلے تو ہمیں انگریز دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا تھا۔ اور اب ان بھیڑیوں کو جنہیں عوام کہتے ہیں قومی سرمایہ دار منڈنے پر لگا ہوا ہے ـــ

یہ ایک تلخ اور دل شکن حقیقت تھی لیکن بہرحال تھی حقیقت ہی۔ میں نے نئے سرے سے کام شروع کر دیا مزدوروں کو منظم کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ آزادی ہماری منزل نہیں بلکہ طویل سفر کا آغاز ہے۔ ابھی تو ہمیں ملک کو سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام سے نجات دلانی ہے تاکہ اس ملک کے وسائل کے مالک ان کے حقیقی وارث یعنی عوام الناس ہو سکیں اور ملک پوری تیزی کے ساتھ ترقی پر گامزن ہو سکے۔ ہندوستان میں ہی میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ مزدوروں کو کسی سیاسی جماعت میں شرکت نہیں کرنی چاہیئے جب تک کہ خود مزدوروں کی اپنی جماعت نہ ہو کیونکہ دوسری جماعتیں مزدوروں کی حمایت سے اقتدار حاصل کر کے اپنی بندوقوں کا رخ انھیں کے جانب پھیر دیتی ہیں۔"

یامین صاحب کی پیشانی پر بل اور چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ کچھ ایسا لگتا تھا کہ وہ بندہ مزدور کے اوقات کی تنگی اور تلخی اور بے سروسامان پر خون کے آنسو رو رہے ہیں ـــ "اور پھر پاکستان میں بھی سیاسی جماعتوں اور مزدوروں کے تعلقات کا کچھ یہی انجام ـــ" "ارے بھائی ہندوستان سے پاکستان کہاں آ پہنچے"۔ حمیدی کچھ سٹ پٹا سا گیا۔

"بس ۳ھ میں میں نے ہندوستان چھوڑ" یامین صاحب نے بولا۔

"کیوں؟"۔ افتخار جلیل کا سوال تھا۔

"یونہی ـــــ ایسے ہی ـــ گھریلو معاملات تھے۔" یامین صاحب کچھ کہتے کہتے رک سے گئے۔

"گھریلو معاملات ـــ کیا آپ ان پر کچھ روشنی ڈالنا پسند کریں گے؟" حمیدی نے سوال کیا۔

"معاملا تو شادی کا تھا۔" یامین صاحب سیاسیات اور معاشیات کے سنگ زاروں سے حسن و عشق کی سرسبز وادیوں میں آتے ہوئے کچھ مسکرائے ـــــ "بھئی اصل بات یہ ہے کہ میں نے اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف شادی کی تھی۔"

"ہوں" ـــ افتخار چہکے ـــــ "پھر تو رومانس کی رنگینیاں بھی آپ کی داستان حیات میں شامل ہیں۔"

"ـــــ نہیں کچھ ایسی نہیں ـــ"

"پھر بھی آپ بتائیے تو سہی ـــ یقین جانیئے ہم وہی چھاپیں گے جس کی آپ اجازت دیں گے۔" حمیدی نے یامین صاحب کو تسلی دی۔

ارے بھائی آپ لوگ تو پیچھے پڑ گئے ــ کچھ بھی تو نہیں تھا۔ یامین صاحب مسکراتے اور لجاتے رہے ـــ "بس میں نے انھیں دیکھا تو جاننے کی کوشش کی کہ یہ کون خاتون ہیں ـــ معلوم ہوا کہ بہت ہی قریبی عزیز ہیں لیکن جاگیردارانہ نظام معاشرت کی بنیادی خصوصیت یعنی خاندانی رنجشوں کی وجہ سے آنا جانا نہیں تھا۔ بہرحال ملاقاتیں ہوئیں اور شادی بھی ہو گئی لیکن میرے لئے ہندوستان چھوڑنا ضروری ہو گیا۔ بس اب تو کچھ نہ پوچھئے گا۔"

"خیر یہاں آکر کیا گزری۔"

پاکستان پہنچنے سے پہلے جو کچھ گزری وہ بھی تو سنئے حضور۔ راستے میں سارا روپیہ ریلوے کے عملے نے اینٹھ لیا۔ اور جب ہم کراچی پہنچے تو ہماری جیب خالی تھی۔ اور صورت حال یہ تھی کہ یہاں پہنچتے ہی ہمارے گھر میں ایک ہستی کا اور اضافہ ہو گیا۔ میں بہت پریشان تھا، نیا علاقہ، نیا ماحول کروں تو کیا کروں ایک عزیز کے توسل سے ۱۰۰ روپیہ ماہوار کی ایک نوکری مل گئی مگر وہ خدا کے نیک بندے ایسے تھے کہ اس کا مستقل احسان جتانے کے موڈ میں ـــ نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۰-۲۵ دن کے بعد نوکری چھوڑ دینی پڑی ـــ دوسری نوکری کی ـــ وہاں یہ حالت تھی کہ تہواروں کی چھٹیاں تک نہ ملتی تھیں۔ لہٰذا ملازمت بھی چھوڑی جسکے بعد داؤد کاٹن ملز میں ملازمت کر لی ـــ یہاں جب میں ـــ تنخواہ لینے گیا تو ٹائم کیپر نے تنخواہ کے رجسٹر پر انگوٹھا لگانے کیلئے کہا میں حالانکہ دستخط کر سکتا تھا۔ مگر وہ بھائی میرا انگوٹھا لگوانے پر ہی اصرار کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا بھی کہ تم تو پڑھے لکھے آدمیوں کو بھی جاہلوں کے خانوں میں رکھ رہے ہو حالانکہ ہونا یہ چاہئے کہ انگوٹھا لگانے والوں کو بھی لگے ہاتھوں دستخط سکھا دو ـــ ٹائم کیپر صاحب ناراض ہو گئے انہوں نے کہا دھاڑی لینا ہے تو لو ورنہ لائن چھوڑ دو میں نے لائن چھوڑ دی اور ساتھ ہی ساتھ نوکری بھی ـــ پیسے لینے بھی کبھی نہیں گیا جو مجھے صرف انگوٹھا لگا کر ہی مل سکتے تھے۔" ہم معاشرے کے اس پر لطف تضاد پر بے اختیار ہنس پڑے۔

"اس کے بعد سیکورٹی پرنٹنگ پریس میں ۵ فروری ۵۵ء کو ملازمت کی ابتدا کی۔ آج تک میں ملازم ہوں۔ یہ قصہ بڑا پرانا ہے یامین صاحب سنبھل کر بیٹھ گئے اور ان کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ آ گئی۔ "ہماری انتظامیہ ٹریڈ یونین کی تو مخالف نہیں ہے۔ وہ دراصل ایک ایسی یونین چاہتے ہیں جس میں مزدور بے شعور ہوں ان کے رہنما ان میں خود اعتمادی پیدا نہ ہونے دیں وہ نہیں چاہتے کہ مزدور اس قابل ہوں کہ بے انصافی اور دھاندلی کا مقابلہ کر سکیں دو چار سال بعد تھوڑے بہت پیسے دے کر معاہدہ کر لینے میں انتظامیہ کوئی حرج نہیں سمجھتی لیکن بعض افسر اپنے طور پر یہ سمجھتے ہیں اگر یونین اور انتظامیہ میں کشیدگی بڑھے گی تو ان کی اپنی اہمیت بھی ہو گی حالانکہ جب تعلقات خراب ہوتے ہیں تو انھیں حکام پر زیادہ مار پڑتی ہے میں نے اعلیٰ حکام کو اس طرف توجہ دلائی تو انہوں نے اس بات کو تسلیم بھی کیا ہے مگر درمیانی حکام مفاہمت ہی پیدا نہیں ہونے دیتے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مزدور میری وجہ سے مشتعل ہوتے ہیں۔ ان میں اپنے حقوق کے لئے لڑنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ میرے وجود کو پسند نہیں کرتے ـــ وہ کچھ دیر کے لئے رکے ـــ "موجودہ قصہ تو ترقی کی پالیسی پر شروع ہوا ـــ انتظامیہ کا نقطۂ نظر یہ تھا ترقی کے لئے مدت ملازمت پر اہلیت کو فوقیت حاصل ہے لیکن ہمارا کہنا ہے کہ مدت ملازمت کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا لیکن انتظامیہ نے انتہائی ہٹ دھرمی کے ساتھ اپنے چند نور نظر یا بالفاظ دیگر "چمچوں" کو ترقی دے دی اس صورت حال کا جواب ہم نے متحدہ طاقت سے دیا اور اپنے فرائض کے علاوہ دوسرے کام کرنے سے انکار کر دیا۔" یامین صاحب کرسی پر جھک کر ذرا آگے ہو گئے۔ "دراصل مزدوروں میں قانونی جدوجہد کے ساتھ ساتھ لاقانونیت کا مقابلہ کرنے کی بھی ہمت ہونی چاہئے تاکہ وہ اپنے حقوق کی حفاظت کر سکیں میرا یہ موقف ہی انتظامیہ کو کھلتا ہے انتظامیہ کے سربراہان کی یہ خواہش ہے کہ مجھے نکال کر مزدوروں کی جدوجہد کو کمزور کر دیں وہ سوچتے ہیں جب میرا اپنے ان محنت کش دوستوں کے ساتھ براہ راست تعلق نہیں رہے گا تو یہ لوگ بھی آہستہ آہستہ مردہ ہو جائیں گے لیکن یہ قطعی ناممکن ہے کیونکہ ایک تو میرا اور یونین کے مزدور ساتھیوں کا رشتہ اور ناطہ کبھی ٹوٹنے والا ہے دوسرے مستقل اور مسلسل جدوجہد کے بعد ان میں جو شعور پیدا ہو چکا ہے اسے اب کوئی بھی طاقت ختم نہیں کر سکتی۔"

"پاکستان سیکورٹی پرنٹنگ پریس یونین کی تنظیمی تاریخ سے متعلق بھی تو کچھ بتائیے۔"

"۵۳ء میں جب میں فیکٹری میں آیا تو یہاں یونین بن گئی تھی مگر ابھی رجسٹرڈ نہیں ہوئی تھی اوروں کی طرح میں بھی یونین کا ممبر بنا اور یونین کے رجسٹریشن کے بعد اپنے ڈپارٹمنٹ کا رکن منتخب کیا گیا۔ یونین کے صدر اشتیاق علی سے میری نہ بن سکی انہوں نے ۵۳ء میں مطالبات کا جو چارٹر پیش کیا تھا۔ اس پر کوئی معاہدہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس سلسلے میں یونین اور انتظامیہ کی ایک مشترکہ میٹنگ ہوئی جس میں انتظامیہ کے نمائندوں نے کئی مطالبات تسلیم کر لئے۔ اور انہوں نے تسلیم شدہ مطالبات میں سے ایک پر ضد کی کہ یہ کل طے نہیں ہوا تھا۔ ہم نے اس پر زور دیا کہ اب باقاعدہ کارروائی لکھی جائے اس بات پر مینیجنگ ڈائریکٹر نے کہا آپ کی اور ورکس مینیجر کی جو گفتگو ہوئی ہے میں توثیق کرتا ہوں لیکن مسئلہ تو دراصل یہی تھا کہ ڈائریکٹر اور ہمارے نمائندوں کے درمیان آخر طے کیا پایا ہے اسے انتظامیہ کسی طرح تحریری طور پر لانے کے لئے تیار نہیں تھی اور اشتیاق صاحب جانے کن وجوہات کی بنا پر سب کچھ انتہائی سادہ لوحی سے مان لینے پر آمادہ تھے اور جب میں نے اس کی سختی سے مخالفت کی تو انہوں نے مجھے مجلس عاملہ سے نکال باہر کیا۔ لیکن جلد ہی مزدوروں کے سامنے حقیقت آ گئی۔ ان زبانی وعدوں کو بورڈ آف ڈائریکٹر کے سکریٹری نے یہ کہہ کر ماننے سے انکار کر دیا کہ ان معاملات میں صرف میں ہی بااختیار فرد ہوں اور دوسروں کے فیصلوں کو میں نہیں مانتا۔ ایک ایسی صورت حال پیدا ہو گئی تھی جس کا اندازہ مجھے پہلے ہی سے تھا اب اشتیاق صاحب کسی کو اپنا منہ دکھلانے کے قابل نہ تھا جب انھیں اس کا احساس ہوا تو انہوں نے مجھے مجلس عاملہ میں واپس لینا چاہا لیکن میں نے مطالبہ کیا کہ جس طرح انہوں نے تحریری طور پر مجھے نکالا ہے اسی طرح وہ معافی بھی مانگیں۔ مگر انہوں نے یہ نہیں کیا اور میں مجلس عاملہ کا رکن نہیں بنا حالانکہ میرے ڈپارٹمنٹ سے وہی شخص جاتا تھا جسے میں اور میرے دوسرے ساتھی چاہتے تھے۔ اس خودغرض قیادت کا سہارا لے کر انتظامیہ نے ۱۹۵۹ء میں ڈیڑھ سو ملازمین کو علیحدہ کر دیا اور یونین دیکھتی ہی رہ گئی اس وقت یونین کے صدر چوہان صاحب تھے۔ مجلس عاملہ نے انہیں استعفا دینے پر مجبور کیا۔ اور پھر مجھے صدر منتخب کر لیا۔

"۶۰ء میں پریس کی انتظامیہ کام کم ہونے کا بہانہ تراش کر دوبارہ چھانٹی کرنے کی خواہشمند تھی لیکن ہم نے اس صورت حال کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہم نے انتظامیہ پر یہ واضح کیا کہ ہمارے پاس کام کم نہیں ہے۔ بلکہ ہماری کام کرنے کی صلاحیت و استعداد میں اضافہ ہوا ہے ـــ ۱۹۵۹ء میں جتنے افراد کے ساتھ ہم نے ۳۱۹ ملین پیس چھاپے تھے اسی کے ساتھ ۱۹۶۰ء میں ۴۲۵ ملین پیس چھاپے گئے ـــ آخر آپ ہی بتایئے کہ ہم تو اپنی استعداد میں اضافہ کر کے ملک کی پیداوار میں اضافہ کریں اور اس کا نتیجہ ہمیں یہ ملے کہ نوکری سے ہاتھ دھونے پڑیں ـــ عجیب منطق ہے ـــ اور ہمارے ملکی قوانین کے تحت آجر کو یہ حق ملا ہوا ہے کہ کام کم ہونے کی صورت میں چھانٹی کی جا سکتی ہے۔"

"بھائی اب چائے پھر ہونی چاہیئے ـــ" حمیدی نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

"ضرور ـــ ضرور ـــ" انھوں نے فوراً جواب

دیا جیسے کہ وہ بھی شاید اسی کے منتظر ہوں۔

چائے آنے تک یامین صاحب خاموشی سے کرسی سے ٹیکے بیٹھے رہے۔ اور ہم یامین صاحب کے چہرے کا جائزہ لیتے رہے۔ جس پر عزم اور یقین کی روشنی جھلکتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

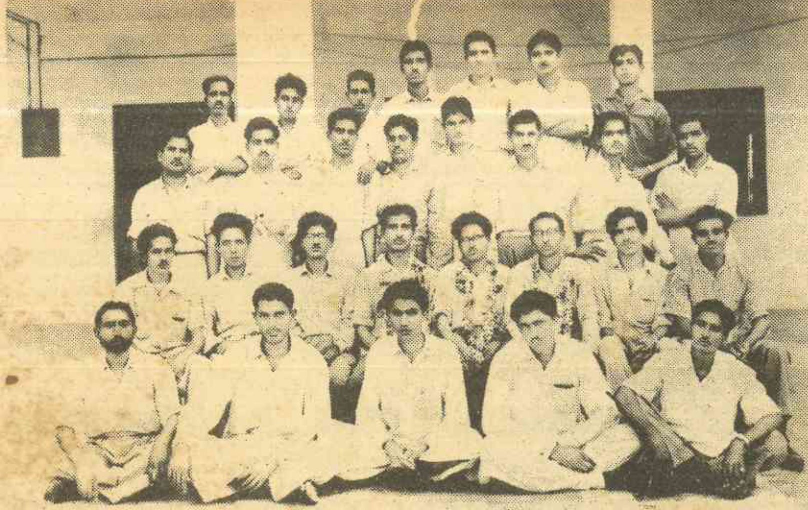
پھر چائے آگئی۔۔ سیکورٹی پرنٹنگ پریس کے دوسرے مزدور کارکن سے ہمارا تعارف ہوا۔۔ اور پھر وہی سلسلہ شروع ہوگیا۔

یامین صاحب کہہ رہے تھے۔

"ہمیں ایک ذریعہ سے معلوم ہوا کہ انتظامیہ نے کراچی ایڈمنسٹریشن سے یونین کے متوقع احتجاجی مظاہروں کو کچلنے کے لئے امداد مانگی ہے۔۔ ہم جانتے ہیں کہ اگست سنہ ۱۹۵۹ء میں DOWN کی تحریک سے انتظامیہ ڈری ہوئی تھی۔۔ اب یہ بات کسی حد تک واضح ہوچکی تھی کہ انتظامیہ چھانٹی کرانا چاہتی ہے۔ اسکی حقیقت جاننے کے لئے ہم نے۔۔ پراویڈنٹ فنڈ کمیٹی کو استعمال کیا۔۔

ہمارے یہاں اس کمیٹی میں دو یونین کے نمائندے بھی ہوتے ہیں جو رقم فنڈ۔۔ میں جمع ہوتی ہے اس کے سیونگ بونڈ۔۔ خرید لئے جاتے ہیں کہ اگر ان بانڈوں کو دس سال پہلے بھنایا جائے تو شرح سود کم ہو جاتا ہے۔

ہم نے اپنے نمائندوں کے ذریعہ پراویڈنٹ کمیٹی میں مطالبہ پیش کیا کہ دس سال گزرنے کے بعد سیونگ بانڈ۔۔ پر ۴۵٪ فیصد منافے کا اوسط آتا ہے اس لئے اسی شرح سے ہر سال ہمارے فنڈ میں اضافہ کیا جائے۔۔ یہ تھا وہ مطالبہ جسے اگر انتظامیہ تسلیم نہ کرتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انتظامیہ جلد ہی بڑے پیمانے پر ان بانڈوں کو بھنانا چاہتی ہے۔ اور اس کا مطلب یہ بھی ہوگا کہ انتظامیہ چھانٹی کی خواہش مند ہے۔۔ ہماری توقعات کے عین مطابق انتظامیہ نے اس پر غور کرنے سے انکار کر دیا۔ اب ہم نے انتظامیہ سے کھل کر چھانٹی کے بجائے کام کے دنوں میں تخفیف کی تجویز پیش کردی۔۔ ہم یہ کہہ رہے تھے کہ انتظامیہ ہفتہ میں چار دن کام لے اور پانچ دن کی تنخواہ دے۔ اس طرح ایک دن کا نقصان ہم برداشت کریں اور ایک دن کا انتظامیہ۔ ہم نے اس انداز سے گفتگو اسلئے شروع کی تھی کہ ہم جانتے تھے کہ ہمارے ملکی قوانین تو سارا تحفظ آجر کو ہی دیتے ہیں اس لئے جتنا بھی ہوسکے کم از کم، پر سودا طے کرلیا جائے۔ جب انتظامیہ نے ہمارے اس مطالبے کو کسی طرح تسلیم نہیں کیا تو ہم نے اسٹرائیک کا نوٹس دیدیا۔۔ انتظامیہ نے ہڑتال کو روکنے کے لئے سپریم کورٹ سے STAY ORDER لے لیا اور ہم نے چھانٹی روکنے کے لئے یہی اقدام کیا۔۔ غرض نہ ہی اسٹرائیک ہوئی اور نہ چھانٹی۔



سنہ ۱۹۶۳ء میں جیل سے رہائی کے بعد یونینوں کے کارکنوں کے ساتھ

"ہماری یونین بہت طاقتور اور متحد ہے اس کے باوجود یہاں صرف ایک بار پانچ چھ گھنٹہ کے لئے تو ہڑتال ہوئی اور دوسری بار ٹوکن ہڑتال تمباکو کمپنی کے ملازمین کی ہمدردی میں کی گئی تھی اور آخری ہڑتال مزدوروں پر فائرنگ کے خلاف احتجاجاً کی گئی تھی۔

اس وقت ہمارے یہاں انتظامیہ کے خلاف تحریک چلائی جارہی ہے کیونکہ ہمارا مطالبہ ہے کہ انتظامیہ نے مجلس عاملہ دو ممبر کے خلاف جو انتقامی کاروائی کی ہے۔ اسے ختم کیا جائے۔" یامین صاحب کچھ دیر کے لئے رکے اور پھر کہنا شروع کیا۔۔ "اور اب ان کے انداز بیان میں مقرر کا رنگ زیادہ جھلک رہا تھا۔" ہمارے منیجنگ ڈائرکٹر صاحب ضرورت سے زیادہ شریف ہیں اتنے شریف کہ دوسرے لوگ انھیں استعمال کرنے لگتے ہیں کچھ ایسا ہی حال ہمارے جنرل منیجر صاحب کا بھی ہے جو کچھ اعلیٰ افسران چاہتے ہیں وہی کچھ ہوتا ہے۔

ہماری یونین کو کمزور کرنے کا ہر حربہ ناکام رہا ہے اور ہم آج بھی پہلے کی طرح متحد اور مضبوط ہیں۔ حالانکہ لوگوں کو یونین کے خلاف کام کرنے کے وعدہ پر نوکریاں دی گئیں مگر ہوا یہ کہ جب وہ کام پر آگئے تو یونین کے سب سے بڑے حامی تھے۔ سپروائزروں کے ذریعہ دباؤ ڈالا گیا اور حد یہ ہے کہ ایک متوازی یونین بنانے کی ناکام کوشش کی گئی۔ لوگوں کو غنڈوں کے ذریعہ پٹوایا گیا اور پٹنے والے افراد پر کئی مقدمات دائر کرائے گئے۔ اور انتظامیہ نے دیکھ لیا کہ ان تمام ہتھکنڈوں کے باوجود ہمارے اتحاد پر کوئی آنچ نہیں آئی" یامین صاحب رکے اور انھوں نے دوبارہ طنزیہ لہجہ میں کہنا شروع کیا۔" انتظامیہ نے اشتیاق صاحب کو ملازمت پر واپس بلایا یہ وہی ذات شریف ہیں جنھوں نے یونین کو کسی زمانے میں کافی نقصان پہنچایا تھا اور اب پھر انتظامیہ کے اشاروں پر مزدوروں میں نفاق ڈالنے کے لئے بلائے گئے تھے۔ لیکن پہلے ہی ان مزدوروں نے ان کا بہت ہی معقول "استقبال" کیا لوگوں نے ان کے منہ پر تھوکا۔ ان کے چپتیں رسید کیں اور انھیں "چمچہ" کے خطاب سے نوازا گیا۔ یہاں پر دال نہ گلتے دیکھ کر اشتیاق صاحب پھر نوکری ہی چھوڑ کر چلے گئے۔

"آپکی یونین کی باتیں تو ہوگئیں اب آپ کچھ مزدور تحریک کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیجیئے" خالد حمیدی نے پوچھا۔

"میرا نظریہ یہ ہے کہ ٹریڈ یونین تحریک دراصل اجتماعی جدوجہد کا نام ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہر شہر، صوبہ اور ملک کے تمام مزدور منظم ہوں تاکہ مشترکہ جدوجہد کرسکیں اور اسی نظریہ کے تحت میں نے کراچی میں کام کرنا شروع کیا تو ہمارے سامنے بہت سے مسائل تھے لیکن ہم نے ان تمام مسائل کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کراچی کے مزدوروں کی یونینوں کی ایک رابطہ کمیٹی بنائی اس کا مقصد یہ تھا کہ کوئی یونین جو کسی بھی نقطہ ہائے خیال کی فیڈریشن سے وابستہ ہو وہ اپنی اس وابستگی کو برقرار رکھتے ہوئے رابطہ کمیٹی سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ جس وقت کراچی کی رابطہ کمیٹی بنی اسوقت تمباکو کمپنی اور دوسری جگہوں پر ہڑتالے چل رہی تھیں۔ ہم نے ان مسائل پر غور کرنے کے لئے جلسہ عام بلوایا لیکن دفعہ ۱۴۴ نافذ کرکے مجھے گرفتار کرلیا گیا اور پھر مزدوروں کے دباؤ کی وجہ سے مجھے رہا کر دیا گیا اس وقت حکومت نے ایک معاہدہ بھی کیا تھا دراصل یہ معاہدہ مزدوروں کے ساتھ ایک بڑا فریب تھا کیونکہ جیسے ہی مزدوروں میں اشتعال کم ہوا حکومت نے دوبارہ ہم سب کو جیلوں کے اندر ٹھونس دیا۔ جیلوں میں ہمارے ساتھ اخلاقی مجرموں سے بھی زیادہ بدتر سلوک کیا گیا اور اب تو حکومت مغربی پاکستان کے پاس۔۔

WEST PAKISTAN PUBLIC ORDINANCE ORDER.

کا ایڈیشن بھی ہے جسکے تحت اخلاقی مجرموں کو ملنے والی سہولیات مثلاً انھیں اپنی صفائی پیش کرنے کا حق ہوتا ہے ان کے اعزا و اقربا ان سے ملنے آسکتے ہیں انکی

سزا کی ایک میعاد ہوتی ہے وہ بھی اگر اچھے چال چلن کا مظاہرہ کیا جائے تو اس میں بھی کمی ہوسکتی ہے۔ لیکن ہم ان تمام سہولیات سے محروم تھے اور صدمہ یہ ہے کہ بہترین رویہ کے باوجود (حیدرآباد کے جیل کے علاوہ ہمارے رویہ کی، بڑی تعریف کی تھی) ہماری قید کی میعاد میں اضافہ ہی ہوتا گیا غرض ایسے حالات تھے کہ ہم بھوک ہڑتال پر مجبور ہوگئے اس کے بعد حکومت نے تھوڑی بہت سہولت دی"۔

یامین صاحب نے دوبارہ چائے منگوانے کے لئے ایک صاحب سے کہا اور ہم سے مخاطب ہوئے۔ "آخر بڑے سیاسی رہنما بھی اسی قانون کے تحت جیل میں جاتے ہیں لیکن انھیں جیل میں اعلیٰ کلاس ملتی ہے اور یہی وجہ ہے آج تک انھوں نے مظالم کے خلاف آواز نہیں اٹھائی زد میں تو ہم ہی آتے ہیں۔ وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں یا کرتے ہیں اس میں انکا سیاسی مفاد چھپا ہوا ہوتا ہے — جبکہ ہمیں روٹی روزگار کی جدوجہد کرنے کے جرم میں کیسے کیسے مصائب سے گزرنا پڑتا ہے اور حکومت چاہتی بھی یہی ہے کہ ایسے دل شکن حالات پیدا کئے جائیں، جو مزدور کارکنوں کے حوصلے پست کردیں۔ وہ کچھ دیر کے لئے رکے۔

مزدوروں میں زیادہ سے زیادہ تعاون پیدا کرنے کیلئے مغربی پاکستان کی ٹریڈ یونینوں کے کارکنوں کی میٹنگ لاہور میں کی گئی تھی — یہ بہت ہی کامیاب تجربہ رہا۔ ہم مزدوروں میں گئے اُن کے مسائل کو سمجھا اور تعاون کی ابتداء ہوئی — ہم نے مطالبات کا چارٹر بھی مرتب کیا اور پورے ملک میں ہمہ گیر تحریک شروع کرنے والے تھے۔ لیکن صدارتی انتخاب سے ہماری تحریک کو بہت نقصان پہنچا۔ دراصل اس پورے ہنگامے سے مزدور بہ حیثیت مجموعی الگ بھی نہیں رہ سکتے تھے لیکن بہتر ہوتا کہ الگ رہتے — بہر حال اب دوبارہ از سر نو کام شروع کرنا ہے۔

ایک اور خرابی ہے — وہ یہ کہ مشرقی پاکستان کے مزدوروں سے ہمارا کوئی رابطہ نہیں ہے۔ حالانکہ وہ جس طرح سیاسی میدان میں ہم سے آگے ہیں۔ اسی طرح مزدور تحریک بھی آگے نکل چکی ہے۔ ہم انکے تجربات سے کافی فائدہ اٹھا سکتے ہیں اس لئے اس بات کی زیادہ ضرورت ہے کہ ملک کے دونوں حصوں کے مزدوروں میں رابطہ قائم ہو"۔

چائے آچکی تھی اور ہم لوگ چائے پیتے رہے اسی وقت سیکورٹی پرنٹنگ پریس کے کئی نوجوان مزدور آئے اور وہ یامین صاحب سے صلاح مشورہ کرتے رہے اور ہماری باتوں کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ ان سے فارغ ہونے کے بعد یامین صاحب پھر ہم سے مخاطب ہوئے۔

"ہاں بھئی اور کچھ مزدور رہنماؤں کے بارے میں کہیئے"۔ افتخار جلیل نے سوال کیا۔

اسی وقت ایک صاحب یونین آفس میں داخل ہوئے اور انھوں نے پوچھا "یامین صاحب کون ہیں"۔ یونین آفس میں بیٹھے ہوئے ایک کارکن نے یامین صاحب کی طرف اشارہ کردیا۔

"آپ کو تھانے میں انچارج صاحب بلا رہے ہیں"

"اچھا۔ ابھی آتا ہوں"۔ یامین صاحب کا چہرہ احساس سے عاری تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ بلاوا غیر متوقع نہیں ہے۔

"ذرا جلدی آجایئے گا۔ انچارج صاحب تھوڑی دیر کو ہیں"۔

"ہاں، ہاں — میں آتا ہوں"۔ یامین صاحب کے لہجے میں عزم اور خود اعتمادی جھلک رہی تھی۔

وہ شخص چلا گیا۔ ایک لمحہ کے لئے تکلیف دہ خاموشی چھاگئی۔ اس سکوت کو یامین صاحب نے ہنستے ہوئے توڑا۔

"دیکھا بھائی بلاوا آگیا۔ پھر یہ فروری کا مہینہ بھی ہے۔ اسی مہینے میری زندگی کے سارے اہم واقعات رونما ہوئے۔ اسی مہینہ میں پیدا ہوا — اسی ماہ میں سیکورٹی پریس میں ملازمت کا آغاز ہوا، اسی ماہ میں پہلی گرفتاری ہوئی۔ اسی ماہ میں، مجھے معطل کیا گیا۔ اور جانے کیا کیا ہونے والا ہے۔ خیر چھوڑیئے اسکو ہم اپنے مزدور رہنماؤں کی بات کر رہے تھے۔

مخلص اور بے لوث رہنماؤں کا قحط تو نہیں۔ لیکن قلت ضرور ہے۔ اور کچھ لوگ تو ہماری تحریک میں گھسے ہی اپنے ذاتی مقاصد کے لئے تھے۔ مثلاً ایک صاحب جو کبھی انڈسٹریل کورٹ میں مزدوروں کے نمائندے تھے اب ایک بنک چلاتے ہیں دوسرے صاحب جو سرمایہ داروں کے ایجنٹ ہونے کے باوجود مزدوروں کے ہمدرد ہونے کا روپ گھڑے ہوئے تھے اور رحیم یار خاں میں پرسنل آفیسر بنے ہوئے ہیں۔ اور اپنے ان تمام تجربات سے فائدہ اٹھا رہے ہیں جو مزدور رہنما ہونے کی وجہ سے انھیں حاصل ہوئے تھے یہی حال ایک ایسے لیڈر کا ہے جو کل تک بار بار شہر بدر کئے جاتے رہے تھے آج ان قوانین کے بارے میں جو مزدور تحریک کو کچلنے کے لئے بنایا جارہا ہے فرمایا "اگر حکومت نے ان قوانین کو نافذ نہ کیا تو میں حشر کے دن دامن گیر ہوں گا"۔ اور حکومت عجب کشمکش میں ہے کیونکہ نافذ ہونے کی شکل میں دنیا میں ہم دامن گیر ہونے کو تیار ہیں۔

ایک واقعہ اور بھی بتاتا چلوں۔ ہماری یونین انٹرنیشنل گرافکل فیڈریشن سے منسلک ہے اور ۱۹۶۱ء میں اس یونین نے ہمیں ایک بین الاقوامی اجتماع میں شرکت کی دعوت دی تھی ہماری حکومت نے پاسپورٹ اور ویزا تو دیدیا لیکن روانہ ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے، پاسپورٹ ضبط کرلیا گیا۔ میرے خیال میں اس حرکت کی یہی وجہ ہوسکتی ہے کہ بین الاقوامی کانفرنسوں میں جو نمائندے شرکت کے لئے جاتے ہیں وہ یا تو سرکاری پالیسی یا پھر سرمایہ داروں کی نمائندگی کرتے ہیں میں کسی ایسی پابندی کے ساتھ تو جا نہیں رہا تھا بلکہ میں حقیقی معنی میں مزدوروں کے نظریات کی عکاسی کرتا اور اسی خطرہ کی بنا پر مجھے باہر نہ جانے دیا"۔ اتنا کہہ کر یامین صاحب کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے شاید وہ یہ سوچ رہے تھے کہ ہمارے ملک میں یہ صورت حال کب تک رہے گی۔ شاید وہ یہ سوچ رہے تھے مزدور کب اپنی حقیقی نمائندگی کرسکیں گے۔

"ایک بات اور کہتا چلوں کہ ہمارے سیکورٹی پرنٹنگ پریس کے ملازمین کے چاروں طرف نوٹ ہی نوٹ بکھرے رہتے ہیں، لاکھوں کروڑوں کا حساب کرتے ہیں لیکن جب وہ فیکٹری سے باہر نکلتے ہیں تو انکی جیبیں خالی ہوتی ہیں۔ ہمارے نظام میں کچھ ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ کہ دولت تو مزدور پیدا کرتے ہیں لیکن وہ دولت قارونوں کے خزانوں میں دفن — ہوجاتی ہے اور مزدوروں کے حصے میں۔ بھوک جہالت اور بیماری کے سوا کچھ نہیں آتا صدیوں پرانے اس تصویر کے رنگ و روغن آج بھی تازہ نظر آتے ہیں۔ ہزاروں سال پرانا ناٹک آج بھی کھیلا جارہا ہے — آخر یہ کب ختم ہوگا"۔

یامین صاحب کچھ دیر کے لئے رکے اور پھر کہنا شروع کیا "ہم جانتے ہیں کہ یہ ناٹک یہ نظام ہم سے ہی ختم ہوگا اور ہم ہی اسے ختم کریں گے"۔

"اچھا بھائی۔ بس۔ یا اور کچھ —؟"
یامین صاحب نے خود ہی سوال کیا۔

"ہاں۔ اگر آپ کچھ اور کہنا چاہتے ہیں تو کہیئے"۔

"میرے خیال میں ساری باتیں ہوگئیں — اب مجھے تھانے بھی جانا ہے"۔

ہم سب کھڑے ہوگئے — یامین صاحب نے تالا لگایا اور ہم سب تھوڑی دور تک ساتھ ساتھ چلے۔

انھوں نے ہم سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ انکے ہاتھ کے دباؤ میں وہی خلوص تھا اور انکی آنکھوں میں وہی چمک۔

"کہیئے آپ کا کیا خیال ہے۔ اسوقت میں تھانے جاؤں یا نہ جاؤں"۔

"اس کا فیصلہ تو آپ ہی کرسکتے ہیں"۔

"اچھا میں جاؤنگا لیکن ذرا ضمانت کا انتظام کرلوں"۔

مصنف ولا برا احمد (بنگلہ کہانی)



دس روپے کا نوٹ

مترجم :۔ وفاراشدی

غفور اندھا دھند لکڑیاں پھاڑے جا رہا تھا۔

امیرن اس کے قریب کھڑی تھی۔ جب کچھ لکڑیاں کٹ گئیں تو اس نے لکڑیوں کی ایک گانٹھ امیرن کے کندھے پر رکھ دی۔ امیرن لکڑیوں کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھی۔ شاید اس لئے کہ لکڑیوں کا وزن اسکی طاقت سے زیادہ تھا۔ غفور کافی لکڑیاں پھاڑ چکا تھا۔ وہ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ اسے اس بات پر طیش آیا کہ وہ اتنی سی لکڑیوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ وہ آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ نہ صرف امیرن سے ساری لکڑیاں چھین کر ایک طرف پھینک دیں۔ بلکہ امیرن کو اس زور سے دھکا مارا کہ وہ زمین پر جا گری۔ امیرن کا سر لکڑی کے ایک گٹھے سے جا لگا۔ اسے سخت چوٹ آئی۔ امیرن عالم بے بسی میں رونے لگی۔ بے انتہا غصّے کی وجہ سے غفور کا دماغ قابو میں نہ تھا۔ اس کا چہرہ دہکتی آگ کی طرح سرخ ہو رہا تھا اس کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ دندناتا ہوا اپنے گھر کے اندر چلا گیا۔ باورچی خانے میں بھات (چاول) پکا ہوا رکھا تھا۔ اس نے کھانے کے ارادہ سے باورچی خانے کا رخ کیا تھا۔ لیکن بجائے ہانڈی سے بھات نکالنے کے اس پر ایک لات دے ماری۔ ہانڈی کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ چاول زمین پر بکھر گئے۔ غفور نے امیرن پر ایک نظر ڈالی اور گھر سے باہر نکل گیا۔ اسکی عجیب کیفیت تھی سارا جسم غصّہ سے کانپ رہا تھا۔ آنکھوں میں انگارے دھک رہے تھے اور ہاتھ پاؤں میں لرزش تھی۔ لیکن وہ بہت مغموم تھا۔

موسم گرما شباب پر تھا۔ آفتاب عالم تاب نے ساری کائنات کو روشنی کے آغوش میں لے رکھا تھا گرمی کی شدت اور دھوپ کی تمازت ناقابل برداشت تھی پیاس سے غفور کے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے بھوک سے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ لیکن اسے نہ پیاس کی پروا تھی اور نہ بھوک کی فکر وہ غم و غصّہ سے تیز تیز جا رہا تھا۔ اس کے دل میں خیالات کا ہجوم تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کیا اس نے امیرن کو پوری پوری سزا دی ہے۔ یا اور سزا دینی باقی ہے۔ وہ گلی کوچے سے گزر کر جب عام شاہ راہ پر پہنچا تو ایک دم سے اس کے قدم رک گئے۔ قریب کی ایک جھونپڑی سے یہ آواز اس کے کان میں گونجنے لگی۔

”خدا کے لئے بس کرو، مجھ پر رحم کرو
میرا کوئی قصور نہیں۔ مجھ پر وسواس کرو
میں بے گناہ ہوں“

ایک عورت کے زار و قطار رونے اور آہ و زاری کرنے کی درد بھری آواز سے غفور کے دل پر گہرا اثر ہوا وہ شش و پنج میں پڑ گیا۔ اس کی نظروں کے سامنے امیرن کا نقشہ ابھر آیا۔ اس کا دل جیسے خود بخود بیٹھنے لگا۔ اور اس کے سر میں چکر آ گیا۔ اسی اداسی اور مایوسی کے عالم میں سڑک کے کنارے ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ دکان کا مالک کالو غازی دکان بند کر کے کھانے کے لئے گھر گیا ہوا تھا۔ غفور کا اضطراب بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ وہاں سے اٹھا اور ایک درخت تلے بیٹھ گیا۔ سورج اس کے سر پر تھا۔ دوپہر کی چلچلاتی دھوپ کا اثر براہ راست اسکی طبیعت پر پڑ رہا تھا۔ جامن کے گھنے درخت کی ایک شاخ پر بلبل کی سریلی آواز سے اس کے دل کے تار لرزنے لگے وہ خیالوں کی دنیا میں کھو گیا۔ فوراً ہی اس کے ذہن پر یہ سوالیہ فقرے ابھر آئے۔

”کیا امیرن خطاوار ہے؟“
اگر امیرن بے گناہ ثابت ہوئی تو ....؟

اس بھرے سنسار میں غفور اور امیرن ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی تھے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہنسی خوشی اپنی زندگی کا سفر طے کر رہے تھے کچھ دنوں سے غفور اینٹ کے ایک کارخانے میں ملازم ہو گیا تھا جو اس کے گھر سے چند میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ وہ روزانہ جتنا کام کرتا تھا اسے اتنی ہی مزدوری مل جاتی تھی۔ اسے دن میں جو پیسے ملتے وہ دن ہی میں ختم ہو جاتے۔ کل اسے کتنی اجرت ملے گی اس کا اسے کوئی علم نہ تھا۔ اس کی نہ تو ملازمت مستقل تھی اور نہ کوئی مزدوری ہی مقرر تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اسکی زندگی خانہ بدوشوں کی سی ہو کر رہ گئی تھی۔ آج یہاں تو کل وہاں۔ جہاں آب و دانہ ہوا وہیں ڈیرہ، ڈال دیا۔

اب کئی مہینوں سے اسے بلاس پور میں کام مل جانے سے وہیں ٹھہر گیا تھا۔ اسے یہاں اینٹوں کی کٹائی چھٹائی کا کام ملا تھا۔ اور کچھ روز سے بڑی بے فکری سے دن گزار رہا تھا۔ لیکن ... آج ....
آج تو جیسے اسکی دنیا میں زبردست زلزلہ آ گیا تھا اس کا نظام زندگی درہم برہم ہو گیا تھا۔

اس کی شادی کو تین برس گزر چکے تھے۔ اسے اپنی بیوی سے بے حد پیار تھا۔ اور اس کی رفیقہ حیات بھی اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اگر کبھی غفور کی رات ڈیوٹی ہوتی تو امیرن اس کے انتظار میں پلکوں میں رات کاٹ دیتی۔

آج اسکی زندگی میں پہلا واقعہ تھا کہ اس نے اپنی وفادار بیوی پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اسے کسی کل چین نہیں پڑتا تھا کہ اس نے اپنی شریک حیات کو کیوں مارا تھا۔

”اگر واقعی امیرن بے گناہ ہوئی تو۔؟“

یہ خیال اسے رہ رہ کر ڈسے جا رہا تھا اور وہ سخت کرب میں مبتلا تھا۔ اسی کرب و درد کے عالم میں دن تو دن پہاڑ سی رات بھی کٹ گئی۔

وہ بادل ناخواستہ کام پر چلا گیا۔

اور... غفور کا مالک اس کے گھر آ گیا غفور کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا اسکی پریشانی اور اضطرار و اضطراب میں کوئی کمی نہ تھی۔ غفور کے مالک کو کسی ذریعے سے معلوم ہو گیا تھا کہ غفور کی بیوی بڑی سندری ہے اور اکثر غفور کی غیر موجودگی میں اس کے گھر چلا جایا کرتا۔ آج بھی موقع غنیمت جان کر وہ امیرن کے پاس آ گیا تھا۔

”امیرن! ایک گلاس پانی تو پلاؤ۔“

امیرن نے نرم و نازک ہاتھ سے ایک میلے سے المونیم کے گلاس میں پانی لا کر دیا۔ مالک کی نگاہیں امیرن

کے خدوخال پر جمی تھیں - اسکی آنکھوں کے پیچھے سے - بوالہوسی جھانک رہی تھی - اس نے امیرن کی معصوم آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا -

" امیرن میں کل پھر اسی وقت آؤنگا اور تمہارے لئے ہیرے کا ہار بھی لاؤنگا "

اور اس نے امیرن کے ہاتھ میں دس روپے کا ایک نوٹ رکھ دیا اور آہستہ سے ہاتھ دبا کر چل دیا -

امیرن دس روپے کا نوٹ ہاتھ میں لئے بت بنی بیٹھی رہی - جب غفور گھر آیا تو اس نے اسے سارا قصہ کہہ سنایا -

لیکن غفور نے سنی ان سنی کردی اور قریب کی پڑی ہوئی لکڑیوں کے انبار میں سے ایک لکڑی اٹھا کر دے ماری گویا مالک کا غصہ اس نے امیرن پر اتارا -

" کیا واقعی امیرن بے قصور ہے ؟ "

امیرن بے گناہ ہے یہ تو غفور بھی جانتا تھا امیرن نے اس کمینے سے روپیہ کیوں لیا تھا اسے اس بات کا زیادہ غصہ تھا - اس میں امیرن کا کیا قصور - ؟ وہ بھی مجبور تھی وہ تنہا تھی، اس کا گھر تنہا تھا، وہ عورت ذات، نحیف کمزور، کر بھی کیا سکتی تھی - نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی - اف اس کے سوچنے کی طاقت سلب ہوئی جارہی تھی ----

مالک سرمایہ دار ہے - اس کے پاس لامحدود دولت ہے اسکی تجوریاں خزانوں سے بھری ہیں ---- روپیہ اسکی طاقت ہے ..... وہ روپے کے بل بوتے پر سب کچھ کر سکتا ہے - اسے کون روک سکتا ہے - وہ اپنے پیسوں سے عشرتوں کی مالا پہن سکتا ہے سکھ کا محل سجا سکتا ہے - پیسوں ہی سے خوشیاں خرید سکتا ہے -

لیکن غفور ..... ایک مفلس و نادار! غفور! ایک قلاش مزدور - اس کے پاس رکھا ہی کیا ہے - غربت بھوک، ناتوانی، بے بسی بے چارگی ..... لے دے کے دو ہاتھ ہیں - اگر یہ ہاتھ بھی نہ ہوں تو کل اسے دردر کی ٹھوکریں کھانی پڑیں - اور بھیک ..... بھیک مانگنے سے تو مرجانا بہتر ہے -

لیکن اب وہ کیا کرے ؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا - کتے کی طرف آدمی بڑھتا ہے تو کتا بھی غراتا ہے اور اسکی طرف لپکتا ہے اور اگر پاگل کتا کاٹ کھائے تو، اس کا زہر جسم کے اندر خطرناک حد تک پھیل جاتا ہے -

غفور کی حالت ناگفتہ بہ تھی - اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا - کوئی صورت نظر نہ آتی تھی - آفتاب تیزی سے مغرب کی طرف چھپ رہا تھا - شام کی دیوی اپنی سیاہ زلفوں کے سائے میں ساری کائنات کو چھپا یا چاہتی تھی غفور ایک جگہ سے اٹھ کر آبادی سے کچھ دور نالے کے اس پار ایک ٹیلے پر بیٹھ گیا - لیکن وہ اب تک کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا تھا - چاروناچار اٹھا اور گھر کا رخ کیا -

" امیرن دروازہ کھولو "

امیرن نے دروازہ کھول دیا - اور چٹائی پر جا کر لیٹ گئی -

غفور نے اچٹتی نگاہوں سے سارے گھر کا ایک جائزہ لیا - وہ لکڑی جو اس نے امیرن کو پھینک کر ماری تھی - اب تک وہیں کی وہیں پڑی تھی - بھات کی ہانڈی کے ٹکڑے بھی اسی طرح ادھر ادھر پڑے تھے - مٹی کا چراغ ٹمٹما رہا تھا - کمرے میں کہیں اندھیرا کہیں اجالا تھا لیکن روشن کم اور تاریک زیادہ -

غفور نے حیرت بھری نگاہوں سے ایک ایک کونے کا جائزہ لیا اور جوشِ وارفتگی میں امیرن سے لپٹ گیا - اس کے دونو بازوں کو تھامتے ہوئے پکارا -

" امیرن ! "

امیرن کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا --- کمرے میں مکمل سکوت تھا - غفور نے سکوت توڑتے ہوئے کہا -

" اٹھو - امیرن اٹھو ! "

امیرن بل بلا کر رو پڑی -

" نہ رو امیرن نہ رو - میں نے تمہیں بہت تکلیف دی - مجھے معاف کردو - مجھ کو غلط فہمی ہوئی "

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا - امید کی کرن نے اسے زندگی کی نئی راہ دکھائی - اب وہ غم کے بجائے خوشی سے نڈھال ہو رہی تھی - اسکی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک سیلاب امنڈ آیا -

" امیرن ! سنو ! اب ہم اس جگہ نہیں رہیں گے آج راتوں رات یہاں سے چلے جائیں گے - امیرن ! اٹھو - ! "

شوہر کی تسلی آمیز باتوں سے اس کی ڈھارس بندھی - اس کے اندر از سر نو طاقت عود کر آئی - اور اس نے جلدی سے اٹھتے ہوئے کہا -

" جانا ہے تو ابھی چلو - "

" ٹھیک ہے رات کے اندھیرے میں - اس، پاپی بستی کو چھوڑ دیں - ورنہ کل دن کے اجالے میں وہ، حرامزادہ یہاں آدھمکے گا - مجھے ڈر ہے کہ کہیں میرے ہاتھوں اس کا خون نہ ہو جائے "

رات کی تاریکی میں دونوں میاں بیوی گھر سے نکل گئے بڑی سڑک پر پہنچتے ہی امیرن اچانک رک گئی -

" کیا ہوا ؟ " غفور نے استفسار کیا -

" ایک چیز بھول گئی ہوں - "

" کیا -- ؟ "

" ہے کوئی چیز - میں ابھی لے آتی ہوں - "

یہ کہکر امیرن گھر کی طرف لوٹی - پیچھے پیچھے غفور تھا دروازے پر پہنچ کر بولی -



نجیب اسلم

ساحل پر اک شور بپا ہے
شاید کوئی ڈوب رہا ہے

کس آواز پہ زیست کا پنچھی
اڑنے کو پر تول رہا ہے!

تیرے گھر میں رونق ہوگی!
میرا گھر ویران پڑا ہے

جیب میں خالی بوتل لے کر
رند کے در پہ شیخ کھڑا ہے

کون ہے جس کو آج زمانہ
چاند نگر تک ڈھونڈ رہا ہے

دل کی ویراں پگڈنڈی پر !
کس کی یاد کا پھول کھلا ہے ؟

" ذرا دیا سلائی دینا - اندھیرے میں تو کچھ سجھائی نہیں دیتا "

امیرن دیا سلائی لئے گھر کے اندر داخل ہوئی -

دیا سلائی جلانے کی، ٹھک سے آواز آئی -

غفور مایوسی اور بے بسی کے ملے جلے جذبات سے ہمکنار دالان میں ٹہل رہا تھا - امیرن نے کمرے کی دیوار کے ایک شگاف سے وہی دس روپے کا نوٹ نکال لیا جب غفور کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا امیرن دس روپے کا نوٹ لئے کھڑی ہے - اور وہ نوٹ دیا سلائی کی روشنی سے چمک رہا تھا -

حسن کمال

گلیوں کا شہزادہ

میں گلیوں کا شہزادہ ہوں
کیا جانے کتنی صدیوں سے!
ان اونچی نیچی گلیوں میں
بدحال و پریشاں پھرتا ہوں

سب آئینہ خانے ٹوٹ گئے
اور پھر بھی میں مجبور رہا
اک ہاتھ بڑھا سو ہاتھ کھنچے
دنیا کا یہی دستور رہا
میرے دل کو قدموں کے تلے
روندا بھی گیا کچلا بھی گیا
میں آہ بھی لیکن کر نہ سکا

یہ گلیاں میری قاتل ہیں
ان گلیوں کے ہر ذرّے میں
میرے ہی خون کی سوزش ہے
ان گلیوں میں ویرانوں میں
گلپوش بہاریں آ نہ سکیں
دل کی کلیاں مسکا نہ سکیں

پر آج میں سب سے کہتا ہوں
یہ زنداں اک دن ٹوٹے گا
یہ جادو اک دن اترے گا

گلپوش بہارو یہ غنچے
اس طرح اگر کملاتے رہے
تو انگارے بن جائیں گے
اور ان سے آگ وہ نکلے گی
جو ساری بہاروں کے دامن
ساری رنگت ساری خوشبو
کو اک پل میں جھلسا دے گی

گلپوش بہارو! یہ غنچے
بس اس حسرت میں جیتے ہیں
ان پر بھی کبھی رنگ آئیگا

یا تو مجھ کو رنگت دے دو
خوشیاں دیدو خوشبو دیدو
یا نوچ لو میرے لاشے سے
احساس و فکر و فن کا کفن!
میرے تن کے ٹکڑے کر دو

اک قطرۂ خون بچا بھی اگر
ناسور بنے گا سینوں کا
جس آگ میں جلتا تھا ابتک
اس آگ کی لپٹوں میں سب کو
جھلسا دوں گا
کیونکہ آخر ان گلیوں کا
میں مالک ہوں ——— شہزادہ ہوں



عابد یوسفی

"سکوتِ شبِ تنہائی میں"

اک زمانے سے یہی سوچ رہا ہوں پیہم
کون ہے جسکی تمنا میں جیئے جاتا ہوں
کس نے بخشا ہے محبت کا یہ احساس مجھے
کس لئے زہر امیدوں کا پیئے جاتا ہوں

وادیٔ فکر میں بھٹکا ہوں کئی بار مگر
کوئی تدبیر مرے غم کا مداوا نہ بنی
درد کی آگ میں دن رات یونہی جلتا رہا
کوئی امید مرے دل کا سہارا نہ بنی

روز و شب کھلتے رہے آنکھوں میں اشکوں کے کنول
کوئی بھی زلف مرے غم میں پریشاں نہ ہوئی
میں زمانے کے لیے چنتا رہا پیار کے پھول
اک کلی بھی مری تسکین کو خنداں نہ ہوئی

یوں ہی بے وجہ سکوتِ شبِ تنہائی میں
زہر غم ہائے جہاں ہنستے ہوئے پیتا ہوں
کوئی حسرت ہے نہ جذبہ نہ تمنا نہ امنگ
بارہا سوچا ہے میں کس کے لئے جیتا ہوں

معذرت

ڈاکیوں کی حالیہ ہڑتال کی وجہ سے ہمارے بہت سے قارئین فروری ۶۵ء کے شمارہ سے ابھی تک محروم ہیں۔ اور شاید مارچ ۶۵ء کا شمارہ بھی جلد نہ مل سکے۔ ادارہ قارئین سے معذرت خواہ ہے۔ جیسے ہی حالات بہتر ہوئے "منشور" آپکی خدمت میں روانہ کر دیا جائیگا۔

تمغے

علی حامد





پاکستان بننے کے بعد حسن خاں نے شروع شروع میں تو ملازمت ہی اختیار کی۔ لیکن وہ اس ملازمت سے کچھ مطمئن نہیں تھا۔ کیونکہ بقول اس کے ۲۰ سال تک فوج میں بھاڑ جھونکنے کے بعد جب اسے پنشن پر بھیجا گیا تو اسکی قیمت بوڑھی گائے کی طرح گھٹ کر صرف سات روپے کچھ آنے رہ گئی تھی۔ جو کہ حسن خاں کے خیال کے مطابق اس کی خدمات کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ کیونکہ وہ بھی سامراج کا اقتدار بحال رکھنے والی مشینری کا ایک پرزہ رہا تھا۔ مگر وہ اس بات سے خوش تھا کہ جس قوم نے اپنے اقتدار کی جڑیں مضبوط رکھنے کے لئے اس کی زندگی کے بیس پر جوش اور جگمگاتے ہوئے برسوں کی یہ قیمت مقرر کی تھی۔ وہ ملک سے چلی گئی تھی۔ اور اب یہ موجودہ نوکری بھی حسن خاں کو راس نہیں آرہی تھی اور آتی بھی کس طرح جبکہ ساری ساری رات دوسرے چوکیداروں کے سُر سے سُر ملا کر اسے جاگتے رہنا اور خبردار کی آوازیں بلند کرنی پڑتیں اور پھر معاملہ رات پر ہی ختم نہیں ہو جاتا تھا بلکہ اسے صبح ساڑھے سات بجے بڑے صاحب کے چھوٹے صاحبزادے کو اسکول پہنچانے جانا پڑتا۔ اس وقت اسے اپنا جمیل یاد آجاتا جس کو بنگلہ پر آنے سے پہلے چھولوں کی چاٹ بیچنے کے لئے روانہ کرکے آتا۔ جمیل کی یاد آتے ہی وہ بے چین ہو جاتا اور خیالات بھٹک جاتے۔ بعض اوقات تو وہ اسکول جانے والے راستے کو بھی چھوڑ دیتا۔ جس پر چھوٹے صاحبزادے اس کو صحیح سمت چلنے کیلئے ٹوکتے۔ "او چوکیدار کے بچے، تم نشہ کرکے آتے ہو کیا جو اس طرح بہکتے رہتے ہو!" اور چوکیدار کا بچہ پہلے تو اپنی سات پشتوں کی خیر مناتا جو چوکیدار ہونے سے بچ گئی تھی۔ اور پھر مسکرا دیتا۔ جیسے کہہ رہا ہو "آپ ٹھیک سمجھے چھوٹے صاحبزادے، میں نشہ کرکے ہی تو رات بھر جاگنے کے بعد اب آپ کو اسکول چھوڑنے جا رہا ہوں"

حسن خاں کو یہ نوکری کرتے تقریباً دس سال ہو گئے تھے لیکن اس کی تنخواہ اتنی ہی تھی جتنی پہلے روز مگر وہ صبر و سکون سے اب تک اس جگہ جما رہا تھا۔ اس دوران میں کئی صاحب بدل گئے تھے جن کے ساتھ اچھی بری گذر ہی گئی۔ اور اب یہ نئے صاحب آئے تھے۔ انھیں آئے ہوئے ابھی صرف دو ماہ ہوئے تھے اور اس عرصے میں وہ حسن خاں کے علاوہ کئی نئے چوکیدار رکھ چکے تھے جو ہفتہ دس دن سے زیادہ نہیں ٹھہر سکے تھے۔ کوئی بھی رات و دن کی نوکری کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اور اب تو حسن خان بھی یہی محسوس کر رہا تھا کہ وہ بھی اس ملازمت پر زیادہ عرصے نہیں رہ سکتا۔ اس کے اعصاب پر بھی اب تھکن طاری ہونے لگی تھی۔ آخر ایک دن اس نے بڑے صاحب سے لینے جانے کی اجازت مانگ ہی لی۔ وہ حسن خاں کی بات سنکر چونک پڑے جیسے کسی نے سوتے میں ٹھنڈے پانی کی بالٹی ان پر الٹ دی ہو۔ کیا واقعی تم جانا چاہتے ہو؟ انھوں نے حیرت سے پوچھا۔ انھیں اس کے چلے جانے کا یقین نہیں آرہا تھا۔ اور انھیں یقین آبھی کس طرح سکتا تھا۔ جبکہ اسے یہاں ملازمت کرتے دس سال گذر گئے تھے۔ اگر وہ یہ جانتے کہ حسن خاں اتنا پرانا چوکیدار ہونے کے باوجود بھی چلا جائے گا تو وہ بہت پہلے کسی دوسرے چوکیدار کا انتظام کر لیتے۔ اس کے لئے چاہے انھیں پورے پینتالیس روپے ہی تنخواہ کیوں نہ دینی پڑتی۔ وہ

آج کسی ایسی تجویز پر غور کر رہے تھے جس کی رُو سے اس چیز کو قانونی حیثیت حاصل ہو جائے کہ کوئی چوکیدار کم از کم اس وقت تک ملازمت ترک نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ یہاں سے تبدیل نہیں ہو جاتے۔ وہ اس وقت بہت پریشان تھے۔ کیونکہ ایک تو پہلے ہی نئے لوگ نہیں ٹک رہے تھے۔ دوسرے اب یہ پرانا چوکیدار بھی جانا چاہتا تھا۔ بڑے صاحب نے ابھی تک حسن خاں کو کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ اتنی جلد جلد ملازموں کے بھاگ جانے کی وجہ جاننا چاہتے تھے۔ پہلے انھوں نے ایک اچھے افسر کی طرح اپنا ہی جائزہ لیا۔ لیکن وہ تو کبھی کسی کے ساتھ سختی سے پیش نہیں آتے تھے۔ رہ گئیں بیگم صاحبہ تو وہ ویسے ہی نیک طینت خاتون تھیں۔ پھر ان کا خیال کام کی زیادتی کی طرف گیا۔ وہ سوچنے لگے۔ کام بھی کچھ زیادہ نہیں۔ رات کو صرف آواز ہی تو لگانی پڑتی ہے اور دن میں سوائے چھوٹے موٹے کاموں کے کچھ نہیں کرنا پڑتا اور نچلے طبقے کے لوگ تو ویسے بھی محنت کے عادی ہوتے ہیں۔ ملک و قوم کی ترقی کے لئے بھی ضروری ہے کہ ہر شخص محنت سے کام کرے دوسرے اگر ان لوگوں سے دبا کر کام نہ لیا جائے تو یہ افسر کو بیوقوف سمجھنے لگتے ہیں۔ اور ان میں کاہلی پیدا ہونے لگتی ہے جو کہ ان کی صحت کے لئے بھی مضر ہے۔ آزادی سے پہلے تو اور بھی سختی برتی جاتی تھی۔ جبھی تو انگریز اتنی کامیابی سے ہندوستان پر حکومت کر گئے۔' اس خیال کے آتے ہی ان کا چہرہ نامعلوم جذبات سے تمتما اٹھا۔ وہ اس وقت چونکے جب حسن خاں نے ہوا سے اڑتے ہوئے کاغذوں کو اٹھا کر قلمدان کے نیچے دبا دیا۔ پھر وہ تنخواہ کے تیس روپیوں کے لئے سوچنے لگے جو وہ حسن خاں کو ہر مہینے کی دس سے پندرہ تاریخ تک بڑی پابندی سے دیا کرتے تھے۔ ان کے خیال میں تیس روپے مہینہ ٹھیک ہی تھا غریب آدمی کا خرچ ہی کیا ہوتا ہے۔ سیدھی سادی زندگی نہ کلب و کینٹین کا خرچہ نہ سگریٹ و پائپ کی لت نہ بیرے خانساماں کی ضرورت۔ بس دال روٹی کتنا سکون ہوتا ہے اس زندگی میں۔ مگر اب تو وہ منظور شدہ تنخواہ یعنی پورے پینتالیس روپے دینے پر بھی آمادہ نظر آرہے تھے۔ مگر ایسا کرنے سے تین کی بجائے دو آدمی رکھے جا سکتے تھے۔ اور اگر وہ اپنی جیب سے ایک آدمی کی تنخواہ دیتے ہیں تو صرف پانچ سو روپے میں کس طرح گزارہ ہو سکتا ہے کیونکہ ایک تو دو آدمی تمام کام نہیں کر سکتے ہیں دوسرے وہ گزیٹڈ افسر ہیں بنگلے پر صرف دو نوکر رکھنے سے دوسرے ہم چشموں میں سبکی جو ہوتی "تو پھر کیا حکم ہے سرکار" ۔ وہ حسن کی آواز سے چونک پڑے "اچھا تم جاؤ۔ میں دوسرا انتظام کر لوں گا۔"

حسن خاں تقریباً ایک سال تک دوسری ملازمت کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ وہ ہر جگہ بڑے اہتمام سے فوج سے ملے ہوئے تمغے عین دل کے اوپر سجا کر جاتا جیسے کسی محاذ پر جا رہا ہو۔ ایک ہاتھ میں کاغذات کا لفافہ ہوتا۔ دوسرے میں لکڑی کا صندلی رنگ کا ایک رول۔ مگر یہ کاغذات و تمغے سب بیکار ہو چکے تھے۔ ان کی اب اتنی بھی اہمیت نہیں رہ گئی جتنی بچوں کے لئے کھلونوں کی۔ وہ جس جگہ بھی جاتا لوگ اسے بڑی عجیب نظروں سے دیکھتے اور بعض منہ پھٹ نوجوان تو اس سے صاف الفاظ میں کہہ دیتے "یہ تو سامراج کی نشانی ہے۔ انھیں اب تو کسی گڑھے میں دفن کر دو یا پھر پگھلوا کر چاندی بنا لو۔ حسن خاں یہ باتیں سننے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ تو یہ توقع لیکر آتا تھا کہ دفتروں میں اس کی بڑی آؤ بھگت ہوگی۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا۔ وہ سوچتا "پتہ نہیں ان سب لوگوں کے دلوں کو کیا ہو گیا ہے؟ میں نے پورے ۲۰ سال برٹش کی نوکری کی ہے۔ یہ لوگ اس کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ نہیں سمجھتے تو جائیں جہنم میں۔ وہ بڑبڑانے لگتا۔ مسلسل اس قسم کی باتیں سنتے سنتے اسکے کان پک گئے تھے اور مزاج میں چڑچڑا پن آگیا تھا۔ اس طرح حسن خاں کو پہلی ملازمت چھوڑے تقریباً ڈیڑھ سال ہو گیا وہ تو خدا کی مہربانی سے اس آڑے وقت میں پنشن کے کچھ بقایاجات مل گئے ورنہ حسن میاں کو دن میں تارے نظر آجاتے۔ بقایاجات ملتے ہی اس نے گھر میں کچھ کھانے پینے کا سامان ڈال لیا۔ جمیل کو پرائمری میں داخل کرا دیا۔ اور جو کچھ بچا وہ صرف ٹھیلہ خریدنے اور اس پر کچھ چیزیں رکھنے بھر ہی کو کافی تھا۔

ابتدا میں تو اسے بہت جھجک محسوس ہوتی جو زیادہ دن قائم نہ رہ سکی اب وہ بلا تامل شہر کی مختلف سڑکوں پر اپنا ٹھیلہ لئے لئے پھرتا۔ اس کو اس سے پہلے اس قسم کا تجربہ نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حسن خاں یہ اندازہ بہت دن تک نہ لگا سکا کہ کس جگہ اس کی بکری ہو سکتی ہے اور کہاں جانا محض وقت برباد کرنے کے برابر ہے۔ وہ اکثر ایسی جگہوں پر کئی کئی گھنٹے کھڑا رہتا تھا جہاں ایک بھی گاہک نہ آتا تھا اور جب وہ وہاں سے جھنجھلایا ہوا چلتا تو ان اسباب کو کوستا جن کی وجہ سے اسے اب بڑھاپے میں یہ ٹھیلہ گھسیٹنا پڑ رہا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ اس کو معلوم ہو گیا کہ پرائمری اسکول میں اسکے چنے اور لائی بک سکتی ہے۔ وہ ہر گاڑی کے آنے سے تقریباً آدھ گھنٹے پہلے اسٹیشن جانے والی سڑک پر بڑے سے گھنے درخت کے نیچے اپنا ٹھیلہ کھڑا کر لیتا اور اپنے ہم پیشہ دوسرے لوگوں سے خوش گپیاں شروع کر دیتا۔ حسن خاں نے اپنی پرانی فوجی وردی میں کافی دن تک اپنی انفرادیت قائم رکھنے کی کوشش کی اور اپنے دوسرے ہم پیشہ لوگوں سے الگ تھلگ رہنا چاہا۔ لیکن لوگ اس سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئے اور ایک دن ایسا آیا کہ حسن خاں صرف حسّو بن کر رہ گیا۔ کیونکہ کسی شخص کا پورا نام لینا ٹھیلے والوں کی روایات کے خلاف تھا۔ جس روز وہ حسن خاں سے حسّو بنا۔ اس روز اس کا کافی نقصان بھی ہو گیا اور جب بھی اس نے احتجاج کیا تو سب نے مل کر اسکو وہ گالیاں دیں کہ بس خاموش ہی ہوتے بنی۔ ہوا یہ کہ اس کے تمام ساتھیوں نے مل کر اسکو حسّو بنانے کی تقریب منا ڈالی۔ اور اس کے ٹھیلے کا بہت سا مال اس تقریب کی نظر ہو گیا۔ سب سے زیادہ تو اسے خود اپنے آپ پر غصّہ آرہا تھا کہ وہ کیوں خاموش رہا۔ اور گت بنتی رہی لیکن وہ کرتا بھی کیا یہ سب اس کے بس میں تو نہ تھا۔ جیسے اسکی قوت مدافعت بھی پنشن پر جا چکی تھی حالانکہ وہ اب بھی اپنی خزاں رسیدہ وردی میں ملبوس اپنے آپ کو کسی محاذ پر تصور کرتا تھا کیا ہوا اگر اسکی وردی کا خاکی کپڑا ہر روز کسی نئی جگہ سے مسک جاتا اور جب وہ کافی پھیل جاتا تو وہاں پر کسی دوسرے کپڑے کی ٹکلی لگ جاتی۔ ہوتے ہوتے اسکی قمیض اور پتلون پر متعدد جگہ رنگ برنگی ٹکلیوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ وردی کا خاکی رنگ بالکل اس طرح ماند پڑ گیا جس طرح مشرق وسطیٰ میں مغربی سامراج۔

حسّو آدھی چھٹی کے وقت پرائمری اسکول پہنچ جاتا اور وہاں وہ ایک طرف اپنا ٹھیلہ کھڑا کر لیتا تاکہ، جمیل نہ دیکھ سکے یوں تو اس نے جمیل کو بھی اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ جب وہ اسکول آئے تو وہ اس طرف نہ آیا کرے اور جب کبھی جمیل کا کوئی ہم جماعت جمیل کو زبردستی اپنے ساتھ اس طرف لے آتا تو وہ بہت خاموش اور سہما سہما سا رہتا حالانکہ اسوقت دونوں باپ بیٹے ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی ہوتے۔

اسکول میں حسن خاں سے چٹ پٹے چھولوں اور املی کی چٹنی کے علاوہ دہی بڑے کی بھی فرمائش ہوتی لہٰذا شام کو گھر واپس آنے کے بعد اسے چھولوں کی تیاری کیلئے چنے بھگونے پڑتے دہی بڑوں کے لئے دال پیسنی پڑتی اور صبح ہوتے ہی سرسوں کے تیل میں انھیں تلنا پڑتا اس تمام کام میں وہ اتنا تھک جاتا کہ رات کو بے سدھ ہو کر پڑ جاتا محنت و مشقت کی وجہ سے جہاں اسکی آمدنی میں قدرے اضافہ ہو گیا تھا۔ وہیں اسکی صحت بھی دن بدن خراب ہوتی چلی جا رہی تھی بعض اوقات وہ آئندہ کے لئے سوچتا تو بری طرح الجھ جاتا اور جب وہ بہت ہی زیادہ پریشان ہو جاتا تو ماضی کی یادوں کو تازہ کرنے کے لئے اپنے ٹین کی چادر کے پرانے بکس کو کھولتا اس میں سے مختلف چیزیں نکال کر الٹ پلٹ کرتا رہتا جن میں کچھ چیزیں تو اسکی بیوی کی یادگار ہوتیں اور بعض اس کے خود کے ماضی کا عکس اس کے لئے سب سے زیادہ اہم چیزوں میں وہی فوج سے ملے ہوئے تمغے ہوتے جنکو وہ اب بھی بڑی احتیاط سے رکھتا تھا چند گروپ فوٹو ہوتے جو اس کے انگریز افسروں کی پارٹیوں کے تھے۔ اور کچھ کاغذات۔ یہ تمام چیزیں اسے بہت عزیز تھیں کیونکہ اس نے انھیں اپنی جوانی کے بیس روشن اور منور سال دے کر حاصل کیا تھا ان تمام چیزوں کو بڑی دیر تک

باقی ص۴۱ پر





عکاس :-

علی اصغر

ہم آس لگائے بیٹھے ہیں :-

عکس و تصوّر



مصوّرہ :-

نسیمہ نسرین



کوئی ہمیں ستائے کیوں :-

خبرنامہ

ٹریڈ یونینوں کی مجلسِ رابطہ کا اجلاس

یکم مارچ شایانِ شان طریقے پر منانے کا فیصلہ

کراچی (نمائندہ منشور) ۱۴ فروری کی شام ٹریڈ یونینوں کی مجلس رابطہ کا ایک اجلاس زیر صدارت جناب حسن رضا صاحب قائم مقام صدر بمقام ٹریڈ یونین آفس ولایت آباد منگھوپیر روڈ منعقد ہوا جس میں بیس رجسٹرڈ یونینوں اور کئی غیر رجسٹرڈ شدہ یونینوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔

اجلاس سے سب سے پہلے ابن ایوب صاحب نے خطاب کیا اور لانڈھی کے صنعتی علاقے میں ٹریڈ یونین سرگرمیوں کے سلسلے میں رپورٹ پیش کی اور ان تمام مشکلات کا ذکر کیا جو یونین بنانے کے سلسلے میں مزدوروں کو پیش آرہی ہیں اور ان انتقامی کارروائیوں کے خلاف سرگرم جدوجہد کی دعوت دی جو مالکان محکمہ محنت کے بے عمل ہونے کے سبب یونین کے کارکنوں کے خلاف عمل میں لا رہے ہیں۔

ان کے بعد ڈائر ٹیکسٹائل اینڈ پرنٹنگ ملز کے نمائندے جناب غیاث الدین نے منگھوپیر کے صنعتی علاقے سے متعلق تفصیلی رپورٹ پیش کی۔ انھوں نے مل مالکان کی مزدور دشمن پالیسی اور محکمہ محنت کے افسران کے رویہ پر سخت تنقید کی۔ انھوں نے اس بات کی سخت مذمت کی کہ رجسٹرار ٹریڈ یونین کے دفتر میں رجسٹریشن کی درخواستوں پر کارروائی افسران کی پسند نا پسند کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ انھوں نے ایسی مثالیں پیش کیں جن میں نام نہاد مزدور کارکنوں کے ایک گروہ کے افراد کو تین دن کے اندر اندر رجسٹریشن دے دیا گیا۔ جبکہ صحیح مزدور یونینوں کی درخواستیں مہینوں پڑی رہتی ہیں انھوں نے کراچی ٹیکسٹائل ورکرز یونین کی رجسٹریشن کی درخواست کا حوالہ دیا جو یکم ستمبر کو پیش کی گئی تھی لیکن آج تک اس پر کوئی کارروائی نہیں ہوئی انھوں نے ابن ایوب سے اتفاق کرتے ہوئے عملی اقدامات کا مشورہ دیا۔

جناب محمد یامین جنرل سیکریٹری گورننگ باڈی مغربی پاکستان ٹریڈ یونین ورکرز کانفرنس نے سنہ ۶۳ء سے لے کر اب تک کے حالات کا جائزہ لیا اور بتایا کہ مغربی پاکستان بنیاد پر مزدور تحریک کو منظم کرنے کے لئے اب تک کیا کارروائیاں عمل میں لائی گئی ہیں انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ان تمام مسائل پر جو کہ مزدور تحریک کے لئے زندگی اور موت کے مسائل ہیں۔ پورے ملک کے دیانت دار کارکنوں کو متحدہ جدوجہد شروع کرنی چاہیئے کیونکہ اس کے بغیر نہ کوئی مطالبہ پورا ہوتا ہے۔ نہ کوئی مسئلہ حل ہوتا ہے۔

ایرویز ایمپلائز یونین۔ پی آئی اے برانچ کے جنرل سیکریٹری صغیر احمد صاحب نے مزدور تحریک کے کردار پر روشنی ڈالی اور کہا کہ صحیح اقدار کا حصول اور تحفظ اس وقت ممکن نہیں ہے جب تک کہ جمہوری تحریکوں کی رہنمائی۔ پچھڑے ہوئے طبقے کے ہاتھ میں نہ ہو۔ اور اس مقصد کے حصول کیلئے لازمی ہے کہ کسان اور مزدور اپنی پیشہ ورانہ تنظیموں کو مضبوط اور فعال بنائیں۔

چاچا علی جان نے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مزدور تحریک ہمیشہ قربانیوں کے بل پر پروان چڑھتی ہے۔ وہ خون جو حق و انصاف کی جنگ میں بہایا جاتا ہے مقدس ہوتا ہے اور اس جنگ میں کام آنے والے شہید کہلاتے ہیں۔ آج تک مزدور طبقہ کو جو کچھ ملا ہے وہ بزرگوں کی قربانیوں کا پھل ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے شہیدوں کو یاد رکھیں اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔ انھوں نے یکم مارچ شایانِ شان طریقے پر منانے کی اپیل کی۔

مسلم کمرشل بینک اسٹاف یونین کے اشرف رضوی صاحب نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ زندگی کی جو حرارت صنعتی مزدوروں کے دل میں ہے میں اسے اپنے ساتھی یعنی کلرک برادری تک پہنچانے کی کوشش کروں گا جو ابھی تک ایک جھوٹے احساسِ برتری کا شکار ہیں۔ انھوں نے صنعتی مزدوروں کو اپنے اور اپنی یونین کے تعاون کا یقین دلایا۔

جلسے سے ایک نوجوان اور پرجوش کارکن گل محمد خاں نے بھی خطاب کیا اور اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا کہ انسان چاہے کہیں پیدا ہو وہ انسان ہے اور برابر کے حق کا مستحق۔ اور مزدور چاہے کوئی زبان بولتا ہو وہ مزدور برادری کا ایک فرد ہے اور اس کا مفاد پوری برادری کے مفاد کے ساتھ وابستہ ہے جو لوگ اس اتحاد کو توڑنے کی کوشش کرتے ہیں وہ انسانیت اور خاص کر مزدور طبقے کے دشمن ہیں۔

اس کے بعد قائم مقام سیکریٹری جنرل واحد بشیر نے حسب ذیل قراردادیں پیش کیں۔

طلبا

اس قرارداد میں تعلیمی ماحول میں شدید انتشار پر گہری تشویش کا اظہار کیا گیا۔ اور مطالبہ کیا گیا کہ آل پارٹیز اسٹوڈنٹس ایکشن کمیٹی کے سیکریٹری مسٹر معراج محمد خاں اور دوسرے طالب علم رہنماؤں کو فوری طور پر رہا کیا جائے۔ طلباء کے خلاف مقدمات واپس لئے جائیں انکی ڈگریاں بحال کی جائیں۔ خارج کردہ طلبا کو فوری داخلہ دیا جائے قرارداد میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا گیا کہ تقریباً سبھی سماجی اور سیاسی جماعتوں نے یکطرفہ طور پر طلبا سے ہڑتال ختم کرنے کی درخواست کی اور اس بات کی ضرورت نہ سمجھی کہ حکومت سے ان کے مطالبات تسلیم کرنے کا مطالبہ کرے۔

کراچی کے فسادات

اس قرارداد میں جنوری کے کراچی کے فسادات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ اور اسے ایک گہری سازش قرار دیا جسکا مقصد محنت کش طبقے کی صفوں میں انتشار پھیلانا اور انکی توجہ اپنے اصل مسائل سے ہٹانا ہے۔ مزدوروں سے اپیل کی گئی کہ وہ ان مذموم کوششوں کے پیچھے چھپے ہوئے اصل مقاصد کو محسوس کریں اور اپنی صفوں میں انتشار پیدا نہ ہونے دیں۔

الیکٹرونک انڈسٹریز

اس قرارداد میں الیکٹرونک انڈسٹریز کے منتظمین کے مزدور دشمن رویئے کی سخت مذمت کی گئی اور مطالبہ کیا گیا کہ انتقامی کارروائیوں کا سلسلہ فوری طور پر بند کیا جائے۔ نکالے ہوئے مزدوروں کو کام پر واپس لیا جائے اور ان کے مطالبات تسلیم کئے جائیں اس کے علاوہ رجسٹرار ٹریڈ یونین سے مطالبہ کیا گیا کہ یونین کو بلاتاخیر رجسٹر کریں نیز اس بات پر حیرت ظاہر کی گئی کہ جب جنوری کی اٹھارہ تاریخ کو انکوائری مکمل ہو گئی ہے تو ابھی تک

خبرنامہ

رجسٹریشن کیوں نہیں دیا گیا۔

کوئٹہ میں کان کا حادثہ

اس قرارداد میں حادثے میں ہلاک ہونے والوں کے خاندان سے گہری ہمدردی کا اظہار کیا گیا اور اس امر پر گہری تشویش کا اظہار کیا گیا کہ آئے دن کے حادثوں کے باوجود کان میں کام کرنے والے مزدوروں کے لئے حفاظتی انتظامات ابھی تک نامکمل ہیں۔ جس کے نتیجے میں انیس، قیمتی جانیں ضائع ہوئیں۔ اس مجرمانہ غفلت کی ذمہ داری کانوں کے مالکوں اور انسپکشن اسٹاف پر ہے۔ حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ حادثے میں ہلاک ہونے والے، مزدوروں کے خاندانوں کے لئے مالکوں سے مستقل پنشن مقرر کروائے۔

پاکستان سیکورٹی پریس ایمپلائز یونین کے صدر محمد یامین کی معطلی

ٹریڈ یونین سرگرمیوں کے بارے میں محمد یامین صاحب کے خلاف انتظامیہ کی طرف سے کی جانے والی انتقامی کارروائی کی شدید مذمت کی گئی۔ انھیں مشورہ دیا گیا کہ صنعتی امن کے قیام کے لئے مزدور دشمنی ترک کر دیں یہ بات واضح کر دی گئی کہ مزدور اپنے آگے بڑھتے ہوئے ساتھیوں پر اس قسم کے حملوں کو خاموشی سے برداشت نہیں کریں گے۔

رجسٹرار ٹریڈ یونین کی پالیسی

اس قرارداد میں رجسٹریشن کی درخواستوں کے سلسلے میں رجسٹرار کے عملے کی طرف سے کی جانے والی بدعنوانیوں کی مذمت کی گئی۔ کیونکہ محکمہ کی طرف سے دانستہ تاخیر نے منتظمین کے حوصلے بلند کر دیئے ہیں اور انھیں اس بات پر اکسایا ہے کہ ہر مزدور کارکن کے خلاف من مانی کارروائی کریں۔ رجسٹرار کو متنبہ کیا گیا کہ اگر یہی صورت حال برقرار رہی تو مزدور عملی اقدام پر مجبور ہوں گے۔

شمالی ویٹ نام پر امریکی حملہ

اجلاس نے اپنی اس حتمی رائے کا اظہار کیا کہ شمالی ویٹ نام پر امریکی حملہ اس جھنجلاہٹ کا نتیجہ ہے کہ جنوبی ویٹ نام کے قوم پرستوں کے ہاتھوں مسلسل شکستوں کی وجہ سے سامراجی جنگ بازوں پر طاری ہوگئی ہے اور یہ حملہ تمام دنیا کے عوام پر حملے کے مترادف ہے امریکہ

یا کسی اور سامراجی ملک کو کسی بھی دوسرے ملک کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں۔ آج مزدوروں کا ایک نعرہ ہے "سامراجیو! ایشیا سے بھاگ جاؤ۔" قرارداد میں امریکی مزدوروں پر زور دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اجارہ دار سامراجی جنگ بازوں کے خلاف اپنی جد وجہد تیز تر کر دیں۔

یکم مارچ

قرارداد میں یکم مارچ کے شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فیصلہ کیا گیا کہ یکم مارچ شایان شان طریقے سے منایا جائے۔ پوسٹر چسپاں کئے جائیں۔ ہینڈبل تقسیم کئے جائیں اور اس بات کی پوری پوری کوشش کی جائے کہ یکم مارچ کو جلسہ عام منعقد کیا جائے۔

آخری قرارداد میں احمد غنی ٹیکسٹائل ملز اور نیشنل ٹائر اینڈ ربر کے مزدوروں سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے انھیں اپنے مکمل اور غیر مشروط تعاون کا یقین دلایا گیا ہے اور مالکان سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ مزدوروں کے مطالبات تسلیم کریں۔

مزدوروں کے لئے مفت قانونی امداد!

لاہور۔ لاہور کے چند مخیر اور عوام دوست وکلاء نے مغربی پاکستان مزدور انجمنوں کو صنعتی تنازعات اور صنعتی عدالت کے مقدمات کے سلسلے میں آنے والی مشکلات میں مفت قانونی امداد دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس امر کے لئے "ٹریڈ یونینز فری لیگل ایڈ سوسائٹی" کے نام سے بجاج مینشن ۴۲ مال روڈ لاہور میں ایک کمیٹی قائم کر دی گئی ہے۔ جس میں ملنے کے اوقات شام ۴ بجے سے رات کے نو بجے تک ہیں مزدوروں اور ان کی انجمنوں کو صنعتی تنازعات اور ٹریڈ یونین معاملات میں قانونی پیچیدگیوں سے پوری واقفیت نہ ہونے کے باعث جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے یہ سوسائٹی ان میں ان کی مفت امداد کرے گی۔ اس سوسائٹی کو چوہدری اصغر خادم، ایڈووکیٹ، عابد حسن منٹو ایڈووکیٹ، اختر قزلباس ایڈووکیٹ، چوہدری خالد محمود ایڈووکیٹ، راس طارق باجوہ ایڈووکیٹ، خان اے حمید پلیڈر، چوہدری بشیر احمد پلیڈر، اور اے جی چوہدری بیرسٹر کی خدمات حاصل ہیں۔

کے، ڈی، اے ورکرز یونین نے ہڑتال کا نوٹس دیدیا

کے ڈی اے ورکرز یونین نے ۱۸، فروری ۱۹۶۵ء کو ان مطالبات پر ہڑتال کا نوٹس دیدیا ہے۔ ۱:۔ آئے دن کی تخفیف اور (LAY OFF) کا سلسلہ بند کیا جائے۔ کے ڈی اے کے تمام ملازمین کی سینیرٹی کا تعین کیا جائے اور اسی کے مطابق ناگزیر حالات میں سب سے کم مدت ملازمت رکھنے والوں کی تخفیف عمل میں لائی جائے۔ ۲:۔ تمام ملازمین کے نظر ثانی شدہ پے اسکیل فوری اور مکمل طور پر نافذ کئے جائیں۔ ۳:۔ جنھیں اس اسکیل سے نقصان پہنچے انھیں اسپیشل انکریمنٹ (خاص اضافہ) دیکر نقصان کی تلافی کی جائے۔ ۴:۔ ٹیکنیکل اسٹاف کو ابھی تک ۶۴ء کی وردیاں نہیں ملی ہیں جس سے نقصان پہنچا ہے۔ اس نقصان کا ہرجانہ ادا کیا جائے اور نئے سال کی وردیاں فوری طور پر دی جائیں۔ ۵:۔ پلانٹ پر کام کرنے والوں کے لئے فوری طبی امداد کا انتظام کیا جائے۔ ۶:۔ پلانٹس پر ورکس کمیٹیوں کا قیام عمل میں لایا جائے۔

اسی دوران کے ڈی اے ورکرز یونین اور کے ڈی اے ایمپلائز ایسوسی ایشن کی ورکنگ کمیٹیوں کا مشترکہ اجلاس ہوا جس میں مطالبہ کیا گیا کہ جن چھیالیس آدمیوں کو ملازمت سے برخاست کیا گیا ہے انھیں فوری طور پر کام پر واپس لیا جائے اور اس وقت تک کسی ملازم کو علیحدہ نہ کیا جائے جب تک کے ڈی اے کے تمام ملازمین کا سروس ریکارڈ مرتب نہ کر لیا جائے۔ اجلاس میں اس بات پر حیرت کا اظہار کیا گیا کہ جس ڈویژن سے پرانے ملازمین کو نکالا جاتا ہے اسی ڈویژن میں دو ہفتہ کے اندر اندر نئی بھرتی کی جاتی ہے جو پرانے ملازمین پر کھلا ہوا ظلم ہے۔

آدم ملز لانڈھی میں ہڑتال ہوتے ہوتے بچ گئی

منتظمین نے ایک دن کی مزدوری دینے کا وعدہ کر لیا

کراچی ۱۱ فروری۔ (اسٹاف رپورٹر) کل آدم ملز لانڈھی کے دبی، ڈیوٹی کے مزدوروں نے وقتی طور سے ہڑتال کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کی تفصیل یوں بتائی جاتی ہے کہ صدر ایوب کی کامیابی کی خوشی میں ۳ جنوری کو مزدوروں کو مل مالکان کی طرف سے چھٹی دی گئی تھی جس میں یہ اعلان نہیں کیا گیا تھا کہ مزدوروں کو چھٹی کے پیسے نہیں دیئے جائیں گے جب کل پیسوں کا جھگڑا پھنسا تو مزدوروں نے اسٹرائک کرنے کا فیصلہ کر لیا پانچ بجے شام کو مزدور لیڈروں اور انتظامیہ میں تصفیہ ہو گیا تو ۵ بجے شام کو مزدور کام پر گئے انتظامیہ نے تحریری طور پر اپنے نوٹس بورڈ پر اعلان کیا کہ مزدوروں کو چھٹی کی تنخواہ دی جائے گی تب یہ ہڑتال ختم کر دی گئی۔ اور معاملہ طے ہو گیا۔

خبرنامہ

ٹریڈ یونینوں کے نمائندوں اور مغربی پاکستان مزدور کارکن
کانفرنس کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے کراچی کے اراکین کا اجلاس

کراچی۔ یکم فروری۔ کراچی کی مختلف ٹریڈ یونینوں کے نمائندوں اور مغربی پاکستان مزدور کارکن کانفرنس کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے کراچی کے اراکین نے اپنے اجلاس میں غنڈہ گردی کی سخت مذمت کی ہے۔ جس کا تازہ ترین شاہ کار رکن صوبائی اسمبلی جناب عبدالباقی بلوچ اور صحافی جناب ضمیر احمد قریشی پر بزدلانہ فائرنگ ہے۔ اجلاس میں ضمیر احمد قریشی کے پسماندگان اور باقی بلوچ سے گہری ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اس سیاسی غنڈہ گردی کا پردہ چاک کرکے اس امر کا ثبوت فراہم کرے کہ برسر اقتدار پارٹی سازش میں شامل نہیں ہے۔

اجلاس میں ریڈیو پاکستان سے بھی مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اس معاملہ میں غیر جانبداری کے ساتھ اپنی خبروں کی پبلسٹی میں عبدالباقی بلوچ کی بیماری کی تفصیلات نشر کرے جس کا پوری قوم کو بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔

اجلاس میں اس خبر کا بھی تشویش سے اظہار کیا گیا ہے کہ مزدور قوانین میں ترامیم کا آرڈیننس جون میں نافذ کیا جائے گا۔ اجلاس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ ترامیم مزدور تنظیموں کی سفارشات کو سامنے رکھ کر کی جائیں۔ اور انہیں پہلے سے شائع کرکے مزدور تنظیموں اور رہنماؤں سے مشورہ طلب کیا جائے۔ اور کوئی بھی ترمیم آرڈیننس کے بجائے قانون ساز اسمبلی میں پیش کی جائے۔

ایک اور قرارداد میں نیشنل ربر اینڈ ٹائر اور واحد عبدالغنی ٹیکسٹائل ملز کے مزدوروں سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا ہے اور اس جدوجہد میں انھیں مکمل تعاون کا یقین دلایا گیا ہے۔

اجلاس میں مغربی پاکستان مزدور کارکن کانفرنس کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے کراچی کے اراکین کے علاوہ حسب ذیل یونینوں کے نمائندے شریک ہوئے۔

ایرویز ایمپلائز یونین۔ پی۔ آئی۔ اے برانچ۔ مسلم کمرشل بینک اسٹاف یونین۔ پریمیر تمباکو ایمپلائز یونین — بکسلے پینٹ ورکس یونین کراچی۔ پاکستان کیبل ایمپلائز یونین۔ پاکستان بیوریج ایمپلائز یونین۔ ویسٹ پاکستان ٹرانسپورٹ ورکرس یونین کراچی برانچ۔ فرسٹ نیشنل سٹی بینک ایمپلائز یونین۔ یونائیٹڈ سالٹ ورکرس یونین۔ مزدور یونینوں کی مجلس رابطہ اسٹیٹ بینک آف انڈیا ایمپلائز یونین۔ انڈسٹریل ڈیولپمنٹ بینک اسٹاف یونین اور پاکستان سکیورٹی پریس ایمپلائز یونین۔

علاقائی آفس واقع منگھوپیر روڈ منعقد ہوا یہ جلسہ رجسٹریشن ملنے کی اطلاع عام مزدوروں تک پہنچانے کی غرض سے بلایا گیا تھا۔ کیونکہ دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کی بنا پر گیٹ میٹنگ لینا ممکن نہ تھا۔ اس اجلاس سے خطاب کرنے والوں میں مشہور ٹریڈ یونین کارکن نبی احمد۔ واحد بشیر اور چاچا علی جان بھی شامل ہیں۔ مقررحضرات نے مزدوروں کو تبلایا کہ موجودہ دور میں رجسٹریشن کو لائسنس جیسی حیثیت حاصل ہو گئی ہے جس کی وجہ سے صحت مند مزدور تحریک کے راستے میں غیر ضروری رکاوٹیں پیش ہیں۔ بہر حال اسکے باوجود بنیادی اہمیت آج بھی اتحاد و اتفاق ہی کو حاصل ہے اور مزدوروں کو چاہیے کہ وہ منظم ہو کر اپنے حقوق ہر ممکن آئینی ذرایع سے حاصل کرنے کی جدوجہد جاری رکھیں۔

یونین کے صدر نے اپنی صداقتی تقریر میں سب سے پہلے نبی احمد کو یونین کی صحیح رہنمائی کرنے پر انھیں خراج تحسین پیش کی اور بعد میں منتظمین کی جانب سے صوبائی منافرت پھیلانے کی کوششوں کی سخت مذمت کی اور مزدوروں سے اپیل کی کہ وہ ایسی شرانگیز حرکتوں سے باخبر رہیں اور اپنے اتحاد سے انھیں ناکام بنادیں نیز منتظمین کی جانب سے یونین کے سرگرم کارکنوں اور عہدیداروں کے ساتھ کی جانے والی انتقامی کارروائیوں پر سخت تنقید کرتے ہوئے منتظمین سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ نافع کما کر دینے والے مزدوروں کی جائز تکلیفوں کا ازالہ کریں اور یونین کے ساتھ مناسب سمجھوتہ کرکے اپنے محب وطن اور انصاف دوست شہری ہونے کا ثبوت دیں۔ اجلاس میں متعدد قراردادیں بھی منظور کی گئیں۔

ایک قرارداد کے ذریعے کوئٹے کی کان کے حادثے پر اظہار رنج و غم کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ کان کے مزدوروں کو دنیا کے دوسرے ممالک کے کان کنی مزدوروں کی طرح سہولتیں فراہم کی جائیں تاکہ اس قسم کے حادثات کا تدارک ہو سکے۔ اور نیز ہلاک ہونے والے مزدوروں کے پسماندگان کو مناسب معاوضہ ادا کیا جائے۔

دوسری قرارداد میں سکوریٹی پریس ایمپلائز یونین کے صدر مسٹر محمد یامین کی ناجائز معطلی کی سخت مذمت کرتے ہوئے منتظمین سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ انتقامی رویہ ترک کریں اور یامین صاحب کے ساتھ کی جانے والی کارروائی کالعدم قرار دیں اور انتشار پھیلانے والے مبینہ سپروائزر کے خلاف تادیبی کارروائی عمل میں لائی جائے۔

ایک اور قرارداد کے ذریعے صحیح اور ایماندار ٹریڈ یونین ورکروں کے ساتھ محکمہ محنت کے بعض افسروں کے مزدور کش جانب دارانہ رویے پر اظہار افسوس کرتے ہوئے محکمہ محنت سے مطالبہ کیا گیا کہ اسٹرائک نوٹسوں اور رجسٹریشن کی کارروائیوں میں رکاوٹیں پیدا کرنے والے افراد کو ان حرکات سے روکا جائے نیز محکمہ محنت کے ذمہ دار افسران سے اپیل کی گئی کہ وہ ہر افسر کو غیر جانب دار مصالحانہ رویہ اختیار کرنے کی تلقین کریں تاکہ موجودہ آئین میں جو کم سے کم حقوق مزدوروں کو حاصل ہیں وہ مزدور اپنی آئینی جدوجہد سے حاصل کر سکیں۔

آخری قرارداد میں محکمہ ڈاک کے ہڑتالیوں سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے ان کے مطالبات کی تائید کی گئی۔ اور ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا گیا اور حکومت سے ان کے مطالبات فوری پورے کئے جانے کی اپیل کی گئی۔

جے، کے، این کورنگی ورکس ایمپلائز یونین کا قیام

کراچی (نمائندہ منشور لانڈھی) جی۔ کے۔ این فیکٹری کے مزدوروں کا ایک اجلاس ۱۳ فروری ۶۵ء کو کورنگی کے علاقہ میں منعقد ہوا۔ جس میں متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا کہ جی۔ کے۔ این کورنگی وارکس ایمپلائز یونین کے نام سے ایک انجمن کا قیام عمل میں لایا جائے تاکہ مزدوروں کی تمام تکالیف کو اجتماعی طور سے دور کیا جا سکے اسی اجلاس میں مزدوروں نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ مطالبات پر پانچ نمائندوں کے ذریعہ منتظمین کو ہڑتال نوٹس دیا جائے۔ اجلاس کے فیصلوں کے مطابق مورخہ ۱۵ فروری کو ہڑتال نوٹس جاری کر دیا گیا اس ہڑتالی نوٹس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ (۱) فیکٹری میں کینٹین کا قیام عمل میں لایا جائے۔ (۲) ورکرز کو تین ماہ کی مدت ملازمت کے بعد مستقل کیا جائے (۳) تمام مزدوروں کو گرم اور سرد وردی دی جائے۔ (۴) تین ماہ کی تنخواہ کے برابر بونس ہر سال ادا کیا جائے۔ (۵) کم از کم تنخواہ ۲۵ پیسے فی گھنٹے مقرر کی جائے۔ (۶) تمام ورکرز کی تنخواہ میں پچیس فیصد کا اضافہ کیا جائے۔ (۷) مہنگائی الاؤنس میں پندرہ فیصد کا اضافہ کیا جائے (۸) تمام ورکرز کو مکان کا کرایہ پندرہ روپے ماہوار ادا کیا جائے۔ (۹) اتوار کو چھٹی مع تنخواہ کے دی جائے نیز چھٹیوں میں اضافہ کیا جائے۔ سالانہ چھٹی ۲۰ یوم اتفاقی ۱۰ یوم بیماری ۱۰ یوم تہواری چھٹی ۱۵ چھٹی یوم اس ہڑتال نوٹس پر سید علی امام، مبشر احمد، گلزار احمد، محمد رشید شیخ اور ابن ایوب نے دستخط کئے ہیں۔

لاہور کے خاکروبوں کے مطالبات

شہر لاہور کارپوریشن کے ملازمتیں کی تنخواہ مہنگائی ہوتے ہوئے اتنی قلیل ہے کہ گزارہ ہونا نہایت

پاکستان بیوریج ورکرز یونین کا جلسہ عام

کراچی ۱۰ فروری آج یہاں پاکستان بیوریج (پاکولا) کے مزدوروں کا ایک جلسہ عام یونین کے صدر مسٹر محمد شریف کی صدارت میں ٹریڈ یونینوں کی مجلس رابطہ کے

خبرنامہ

مشکل ہے۔ یہ بے چارے صبح وشام۔ گرمی۔ سردی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے فرائض منصبی میں کبھی بھی کوتاہی نہیں کرتے۔ اور یہ بے چارے زہریلے جراثیموں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اور کروڑوں محب وطن پاکستانیوں کی صحت کا خیال رکھتے ہوئے خود کو بیماری میں مبتلا کر لیتے ہیں۔ لیکن اتنے دکھوں، مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کے علاوہ ان کی تنخواہیں معقول نہیں۔ اب جب کہ گورنمنٹ مغربی پاکستان نے بلدیاتی ملازمین کے نئے اسکیلوں کا اعلان کیا تو ان ملازمین کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک کیا گیا۔ بعض میونسپل کمیٹیوں میں 75-1-60 اور بعض کمیٹیوں میں 70-1-55 کا گریڈ دیا گیا۔ اور کمیٹیوں کے علاوہ ٹاؤن کمیٹیوں کے ملازمین کو ان دونوں گریڈ میں سے ایک بھی نصیب نہ ہوئے یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوتا ہے کہ تمام خاکروبوں کی ڈیوٹی (کام) ایک جیسی ہے تو ان ملازمین کے ساتھ تفریق کیوں رکھی گئی۔ ایک طرف تو حکومت یہ اعلان کرتی ہے کہ بلدیاتی ملازمین کو سرکاری ملازمین کے برابر گریڈ و دیگر مراعات دی جائے گی۔ لیکن جب نئے اسکیلوں کا اعلان ہوا تو بلدیاتی ملازمین کے ساتھ تفریق کی گئی حالانکہ سرکاری ملازمین کو 80-1-60 کا گریڈ دیا گیا۔ اگر ان ملازمین کی معقول تنخواہ کم از کم ۱۰۰ روپیہ ماہوار کی جائے اور ان کے لئے سستے راشن ڈپو کھولے جائیں تو بھی یہ مزدور خوش حالی کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اور اپنے فرائض منصبی میں بھی کوتاہی کا موقع نہیں دیں گے۔ اور نہ ہی اپنے محب وطن پاکستان میں دباو بیماری کا خدشہ ہوگا۔

پاکستان سے قبل شہر لاہور کی آبادی قریباً ۸-۹ لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ اور اس وقت اتنی کالونیاں بازار۔ سڑکیں۔ گلیاں وغیرہ نہ تھیں اس وقت لاہور کارپوریشن کا عملہ صفائی تقریباً ۲۷۰۰/۲۸۰۰ سو کے لگ بھگ تھا۔ لیکن اب ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق شہر لاہور کی آبادی ۱۸-۱۹ لاکھ پر مشتمل ہے بڑی بڑی کالونیاں لمبے لمبے بازار۔ چوڑی چوڑی گلیاں تیار ہو گئی ہیں۔ ایک آدمی کے پاس دو آدمیوں جتنا کام ہے۔ ۱۶/۱۷ سال کے عرصہ میں ان خاکروبوں کی تعداد میں زیادہ سے زیادہ ۴-۵ سو کے لگ بھگ اضافہ ہوا ہے۔ اور اس وقت عملہ صفائی کی تعداد ۳۱۶۹ ہے جس میں ۲۳۶۹ مرد اور ۸۰۰ کے قریب عورتیں فرائض منصبی سرانجام دے رہی ہیں۔

اگر عملہ صفائی میں آبادی کے لحاظ سے اضافہ کیا جائے تو بھی شہر میں اچھی سے اچھی صفائی رہ سکتی ہے۔

کارپوریشن دن بدن شہری عوام پر اتنے ٹیکس عائد کر رہی ہے کہ عوام ان ٹیکسوں سے اتنے پریشان ہیں کہ ان کو اتنی مہنگائی کے باوجود ذریعہ معاش کیلئے اور گزر گزارہ کرنا مشکل ہو۔ اتنے بھاری ٹیکس کہاں سے دیں۔ لیکن اتنی مشکلات کا سامنا کرنے کے باوجود وہ ٹیکس کی ادائے گی میں گریز نہیں کرتے۔ لیکن عوام تو اپنے فرائض کو پورا کر دیتے ہیں لیکن محکمہ اپنے فرائض کو پورا کرنے میں کوتاہی اور لاپرواہی کا ثبوت دیتا ہے۔

کارپوریشن لاہور میں جو بھی کام ہوتا ہے وہ زیادہ تر پشت پناہی کے نظریئے سے کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں کے افسران اعلیٰ کو رعب اور دباؤ کے ساتھ چلایا جاتا ہے اگر کوئی افیسر کسی چیرمین اور اعلیٰ افیسر کی حکم عدولی کرے تو اس کو اس کئے ہوئے کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ کیونکہ جب کبھی کبھی نائب داروغہ کی اسامی خالی ہوتی ہے تو بڑے افیسروں اور چیرمینوں کی سفارش وغیرہ آجاتی ہے۔ اور ان سفارشی ملازموں کو نائب داروغہ کی اسامی پر لگایا جاتا ہے کہ جو کہ صفائی کروانے کی سوجھ رکھنے کے علاوہ وہ خاکروب کے پاس کھڑا ہونا اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے۔ نائب داروغہ کی تقرری کے وقت صرف خاکروبوں کو مدنظر رکھا جائے۔ اور خاکروبوں کی پریشانی دور کرنے کا صرف اور صرف طریقہ ہے یہ کہ ہماری باتیں دھیان سے سنی جائیں اور ہمارے مطالبات پر ٹھنڈے دل سے غور کر کے انھیں منظور کیا جائے۔ (تحریر۔ آنند سلیم ہاشمی)

گل احمد ٹیکسٹائل ملز کے مزدوروں نے ہڑتال کا نوٹس دے دیا

کراچی (نمائندہ منشور لانڈھی) گل احمد ٹیکسٹائل کے ڈھائی ہزار مزدوروں نے اپنے مطالبات کے سلسلے میں پانچ نمائندوں کے معرفت مورخہ ۱۸ فروری ۱۹۶۵ء کو ہڑتالی نوٹس دے دیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ گل احمد ٹیکسٹائل ملز کے منتظمین نے ایک پاکٹ یونین بنا رکھی ہے اس لئے مزدوروں کے تمام مطالبات بڑی آسانی سے سبوتاژ کر دیئے جاتے ہیں۔ نیز ۱۹۶۳ء، ۱۹۶۴ء کا بونس ابھی تک ادا کیا گیا۔ مزید براں روایات کے مطابق ہر سال ورکرز کو جو کپڑا دیا جاتا تھا وہ بھی نہیں دیا گیا اور گل احمد ٹیکسٹائل ملز مزدور یونین مزدوروں کی نمائندہ یونین نہیں ہے اس لئے مندرجہ ذیل مطالبات پر ہڑتال نوٹس دینا ضروری ہو گیا تھا۔

مذکورہ ہڑتال نوٹس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ تمام کارکنوں کی تنخواہوں میں پچیس فیصد کا اضافہ کیا جائے۔ حاضری الاؤنس کو تنخواہ کا حصہ قرار دیا جائے۔ پراویڈنٹ اسکیم جاری کی جائے، سال ۱۹۶۳ء، ۱۹۶۴ء کا بونس تین ماہ کی تنخواہ کے برابر دیا جائے اور چھٹیوں میں اضافہ کیا جائے۔

منشور سب کا ہے!

خود پڑھیئے!

دوسروں کو پڑھایئے!

ٹرسٹ سرامک فیکٹری کی یونین کے نمائندوں کا دوبارہ اخراج ‏تمام یونینیں مشترکہ اقدام کریں گی

ٹرسٹ سرمک لیبر یونین نے اپنے ایک مراسلے میں یونین کے گیارہ عہدیداروں کی غیر قانونی برطرفی پر احتجاج کرتے ہوئے اسسٹنٹ ڈائرکٹر لیبر ویلفیئر اور دیگر متعلقہ حکام کو مطلع ہے کہ منتظمین فیکٹری نے مسٹر وہاج الدین، عیسیٰ خان، جابر قریشی، موسیٰ خان، محمد عثمان عبدالخالق۔ محمد بن عبداللہ، عبدالستار، آمیر بیگ، آغا محمد، شیخ احمد کو انتہائی دھاندلی اور غیر قانونی طریقے سے دوبارہ کام پر لینے سے روک دیا ہے۔

یاد رہے کہ مذکورہ مزدوروں کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ فیکٹری میں ایک آزاد یونین بنانا چاہتے ہیں اور منتظمین اس بات کو اپنے مفاد کے خلاف سمجھتے ہیں اسی لئے اس سے قبل ۵ اگست ۱۹۶۴ء کو بھی مذکورہ مزدوروں کو ملازمت سے علیحدہ کر دیا تھا جب کہ مغربی پاکستان انڈسٹریل کورٹ کراچی نے ان کی برطرفی کو غیر قانونی قرار دیتے ہوئے انھیں ملازمت پر بحال کر دیا تھا۔ یونین نے اپنے مراسلے میں قانون، انصاف اور صنعتی امن کے نام پر منتظمین سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ قانون کا احترام کرتے ہوئے مذکورہ مزدوروں کو ملازمت پر بحال کر دیں ورنہ نتائج کی ذمہ داری منتظمین پر ہی عائد ہوگی۔ یونین کے ایک ترجمان نے ہمارے نمائندہ کو بتایا کہ ٹرسٹ سرامک انڈسٹریز لیبر یونین اس معاملے کو لانڈھی اور کورنگی کی تمام آزاد یونینوں کے سامنے رکھنے کا ارادہ رکھتی ہے تاکہ مشترکہ اقدام پر غور کیا جائے۔

(قسط نمبر ۳)

ہدایت کار عابدی



متحرک فلموں کی تاریخ

فلم کے ساتھ موسیقی کی وابستگی اور موجودہ دور میں موسیقی اور فلم ایک جان اور دو قالب ہیں۔ فلم سے موسیقی کی وابستگی بھی ایک عجیب واقعہ ہے۔ ابتدائی، زمانے میں جب ان کا "انکاس نور" یعنی پروجیکٹر (فلم کا عکس ڈالنے والی مشین) ایجاد کیا گیا جو کافی وزنی اور بڑا تھا۔ جب یہ چلتا تو کافی زور و شور کی آوازیں پیدا ہوتیں سینما ہال میں اسی شور کو دبانے کے لئے فلموں کے ساتھ موسیقی دینے کا رواج پڑ گیا۔ شہر کے سینما گھروں میں پورے پورے آرکسٹرا موجود ہوا کرتے تھے جو فلموں کے ساتھ نغمے پیش کرتے تھے۔ جبکہ چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں عام طور پر کسی پیانو نواز کی خدمات حاصل کر لی جاتی تھیں۔ اس زمانے میں ہر بڑے شہر میں سینما گھر تعمیر ہونے اور پر تکلف طور پر آراستہ و پیراستہ کئے جانے لگے۔ یعنی عوام میں "فلم" تفریح اور مقبولیت کا درجہ حاصل کر لیا۔ ۱۹۱۴ء تک تو تمام دنیا میں صنعت فلمسازی کا ڈنکا بجنے لگا۔ دنیا کی پہلی جنگ عظیم کے دوران بھی فلم کی تیاری پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ حالانکہ نائٹرو سیلونور "جسکی خام فلم بنانے میں ضرورت ہوتی ہے وہ بارود بنانے میں بھی کام آتا ہے۔ ۱۹۲۵ء میں ناطق فلموں کا رواج ہونے کی وجہ سے فلمی صنعت میں ایک نیا انقلاب برپا ہو گیا۔ آواز کو بڑھانے والے برقی آلے اس "ویلو" پر مبنی تھے جسے شاید اس سے کئی سال قبل ایجاد کر لیا گیا تھا۔ یورپی ٹیلیفون کمپنی کے انجینئروں نے ایک ایسا "انکاس نور" (پروجکٹر) تیار کر لیا تھا جو اس فونوگراف سے ہم آہنگ تھا جس پر پردے کے پیچھے آواز کے ریکارڈ بجائے جاتے تھے۔ اسے "وٹیافون" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ عوام کے سامنے اس کا پہلی بار شاید ۱۹۲۶ء میں مظاہرہ کیا گیا۔ اب عوام "بولنے والی" فلمیں پسند کرنے لگے۔ بعد میں "ڈی فارسٹ" نامی ایک آدمی نے فلم پر راست صدا بندی کرنے کا طریقہ ایجاد کیا جو فونوگراف آنے کے مقابلے میں بہت ہی بہتر نوعیت کا تھا اب آواز کی وجہ سے فلمی صنعت میں زبردست تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں۔ اسکی وجہ سے بعض نامی گرامی اداکار گمنامی کے پردے میں چلے گئے مثال کے طور پر اس زمانے میں "جان گلبرٹ" ممتاز ترین اداکار تھا لیکن، اسکی آواز ناطق فلموں کے لئے موزوں نہیں تھی۔ مگر ان کی "مونچھوں کی تراش" شاید رہتی دنیا تک دنیا کے کونے کونے میں بطور فیشن رائج رہے گی ہمارے ملک میں ایسی تراش کو عام طور پر "نذیر کٹ" یا "تلوار مارکہ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ راقم الحروف کی مونچھیں بھی آنجہانی جان گلبرٹ اسٹائل کی رہین منت ہیں۔

معاف فرمائیں قلم، قلم سے مونچھ تک پہنچ گیا اسی آواز کی بدولت اس کے برعکس "گیری کوپر کی مقبولیت میں کافی اضافہ ہو گیا۔ اسی آواز کے سبب اداکارہ گریٹا گاربو کو بھی ناطق فلموں میں کامیابی نصیب ہوئی آواز نے فلموں کے دائرہ عمل کو اور بڑھا دیا اور مکالموں اور صوتی اثرات کی مدد سے فلموں میں اور زیادہ گہرائی اور حقیقت کا رنگ پیدا کیا جانے لگا۔ فلمی صنعت ۱۹۳۲ء میں ایک اور کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ یعنی ٹیکنی کلر۔ میں تیار ہونے والی پہلی کامیاب رنگین فلم بننے کے بعد رنگ کا زیادہ وسیع استعمال کیا جانے لگا۔ ابتدائی فلموں کے موضوع زیادہ تر معمولی آدمیوں کی روزانہ سرگرمیاں ہوتی تھیں۔ پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر اعصابی [illegible] کرنے اور حقیقت سے فرار حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی اسی ضرورت کے پیش نظر فلمی صنعت کے — چابکدست ہدایت کاروں نے عوام کے سامنے دیو مالائی۔ اور ملبوساتی مردوں اور عورتوں کی انتہائی تعیش پسندانہ اور جادوئی فلمیں پیش کر کے بروقت عوام کی خدمت کے ساتھ ساتھ داد تحسین بھی حاصل کیں —

مثال کے طور پر "بغداد کا چور" (سابقہ کا) "بن ہر" (سابقہ کی) "رابن ہڈ" اور "پیرس کا کبڑا" (سابقہ کا) جیمس "ڈگلس فیربینکس" "ریمن نوویرو" اور "لال چینی" نے بے مثال کردار نگاری سے عوام کو محو حیرت کر دیا تھا۔ اسی دوران عوام نے بعض فلمی موضوعات اور انکی پیش کش میں شائستگی اور بلند مذاقی سے انحراف کے خلاف احتجاج کرنا شروع کر دیا۔

فلموں کی بے پناہ مقبولیت اور بالخصوص نوعمر اشخاص پر فلموں اور اداکاروں دونوں کے زبردست اثر کی وجہ سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اگر فلمی صنعت نے خود ہی ایسے ضابطوں پر عمل نہ کیا جو فلموں پر وفاقی احتساب کا مطالبہ کرنے لگیں۔ اس طرح غالباً ۱۹۲۲ء میں متحرک فلمیں بنانے والوں اور تقسیم کرنے والوں کی انجمن قائم ہوئی اور فلمی صنعت کاروں نے ایک مشہور اور رسائی اعتبار سے کوئی دلچسپی نہ رکھنے والے شخص کا انتخاب برائے صدر کیا۔ جسکا نام "ول ہیز" تھا۔ اگرچہ یہ انجمن صنعت کے کاروباری پہلو میں باضابطگی پیدا کرنے کے لئے بھی قائم کی گئی تھی۔ لیکن اس کا بڑا مقصد حکومت کے احتساب کو دور رکھنا اور خود ہی احتساب کرنے کی ایک ایسی پالیسی منضبط کرنا تھا جس کی تمام رکن پابندی کریں۔ اس طرح جو پابندی عائد کی گئی ان سے شروع میں تو کچھ بہتری واقع ہوئی مگر آہستہ آہستہ بعض فلمساز۔ ایسی فلمیں بنانے لگے جو فنی اعتبار سے تو ضابطوں کے مطابق تھیں لیکن بعض صورتوں میں ان ضابطوں کے مفہوم نکالنے میں بڑی کھینچ تان سے کام لیا گیا تھا۔ جبکہ بعض فلموں سے موجودہ اخلاقی ضابطوں اور روایات کے کمزور پڑ جانے کا اظہار ہوتا تھا۔ کچھ فلمیں ایسی بھی تھیں جن میں ان پر زور دیا گیا تھا اور انھیں موثر انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ اسکی مثال سابقہ کی "دی ٹن کمانڈمنٹس" اور "حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کہانی" "دی کنگ آف کنگز" (سابقہ) جیسی فلمیں تھیں متحرک فلموں کی ترقی اور مقبولیت کا حال تو مندرجہ بالا یورپ اور دیگر ممالک کا تھا۔ ہمارے غیر منقسم برصغیر میں سب سے پہلے عوام کی تفریح طبع کے لئے ہر بڑے شہر میں تھیٹر کا رواج عام تھا جن میں بیشتر ڈرامے "آغا حشر کاشمیری" کے مقبول ہو چکے تھے متحرک فلم نے

متعلق دنیا کے گوشے گوشے میں چرچے ہو رہے تھے۔ یہی حال اس برصغیر کا بھی تھا۔ غالباً ۱۹۰۰ء میں سب سے پہلے یہاں شہر بمبئی کے "تاج محل ہوٹل" کے ایک ہال میں متحرک فلم کی نمائش کی گئی۔ رات میں جب ہال میں تاریکی پھیل گئی تو پردے پر غیر معمولی روشنی پڑی۔ پھر دو خوبصورت لڑکیاں جن کے بال سرخ تھے اور جنھوں نے گلابی اور نیلے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا بڑی سرگرمی کے ساتھ رقص کرتی نظر آئیں جب وہ پردے پر سے غائب ہوگئیں تو ایک پتھریلی چٹان کے قریب ریتیلے ساحل پر سمندر کی غضبناک لہروں کے ٹکرانے کے منظر نے تماشبینوں کو محو حیرت کردیا۔ جونہی لہریں ساحل سے ٹکرائیں اگلی صفوں میں بیٹھے ہوئے معززین اور دیگر تمام تماشائی چیخیں مار کر نیچے جھک گئے اور بھاگ گئے یہ متحرک فلم کی پہلی نمائش تھی۔ یہ ایک ہزار فیٹ کی طویل فلم تھی جسکا قدرے حصّہ رنگین بھی تھا جو فلم کے ابتدائی آلے کی مدد سے دکھایا گیا تھا جسکو غالباً "ایڈی سن" نے بنایا تھا۔ اس رات کو تاریخی اہمیت حاصل ہے۔

کیونکہ اس رات کے غیر معمولی شو کے بعد سارے برصغیر میں متحرک فلم کے چرچے ہونے لگے سارے عوام بے چین تھے کہ آخر وہ کیا شے ہے جو ایک معمولی کپڑے کے پردے پر چلتی پھرتی زندہ جاوید حرکت کرتی ہوئی چیزیں اور انسان نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد "دھندراج گوبند پھالکے" جو بعد میں دادا پھالکے کے نام سے مشہور ہوئے سب سے پہلے "ہریش چندر" نامی فلم بنائی۔ جو اس برصغیر کے پہلے فلمساز اور ہدایت کار تھے اور یہاں کی پہلی فلم یہی تھی سارے ملک میں اسکی کامیابی کے ساتھ نمائش کی گئی۔ اس کے بعد "دادا پھالکے" نے مزید کئی فلمیں بنائیں۔ وہ تقریباً (۲۱ سال) تک فلمیں پیش کرتے رہے جنکی تعداد غالباً ایک سو کے قریب ہیں۔ اسکے بعد تھیٹر کو زوال شروع ہوگیا۔ اسی دوران متعدد فلم کمپنیاں قائم ہوئیں مثال کے طور پر "سروج مویٹون" "کوہ نور کمپنی" "امپریل کمپنی" وغیرہ جنھوں نے کافی فلمیں تیار کیں جن میں "نل دمینتی" — "ٹیلیفون گرل" "گل بکاؤلی" "لارڈ آف جنگل" "انسان یا شیطان" وغیرہ۔ اس زمانے کے شہرت یافتہ اداکاروں میں "مس گلاب" "مس گوہر" "سلوچنا" "للیتا پوار" "زبیدہ" "ماسٹر وٹھل" "ماسٹر نثار" "بلیموریا" "نندرام پہلوان" — "جانی بابو" "عبدالرحمٰن کابلی مرحوم" "جے راج" "کالے" "پربھا شنکر" "جال مرچنٹ" "ہادی" "ڈبلیو ایم خان" — "حافظ جی" وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ انھیں دنوں ایک میرے بچپن کا ایک واقعہ عرض ہے جو کافی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ ہمارے شہر میں یوں تو اس زمانے میں بھی کافی تعداد میں سنیما ہاؤس تھے مگر ایک سنیما انتہائی خراب حالت میں ٹنٹ وغیرہ کا بنا ہوا تھا جسکا مالک غالباً راجیشور نامی کوئی شخص تھا جو بالکل بے تعلیم یافتہ تھا۔ اسی سنیما میں شاید "بھٹکتی مینا" فلم چل رہی تھی جس میں ماسٹر وٹھل ہیرو تھا ہیروئن کا نام مجھے یاد نہیں ہے کہ کون تھی ایک منظر میں ماسٹر وٹھل بندوق لے کر ایک پرندے کو مار گراتا ہے۔ سینما کے مالک نے حاضر دماغی سے کام لے کر اپنے سینما کے چوکیدار کو سنیما کے پردے کے پیچھے یہ ہدایت دے کر کھڑا کردیا کہ جس وقت سین میں ماسٹر وٹھل بندوق سے پرندے پر نشانہ لے وہ خود اپنی بندوق سے ہوائی فائر کردے۔ اس تجربہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ جب شو میں ماسٹر وٹھل کی بندوق سے تماشائیوں نے جب فائر کی آواز سنی تو سارے ہال کے لوگ پریشان ہوکر اپنی نشستوں سے اچھل پڑے۔ ان کیلئے یہ آواز بالکل نئی تھی۔ اب کیا تھا شہر میں ڈنکا بجنے لگا کہ فلم بھٹکتی مینا میں ماسٹر وٹھل کی بندوق سے فائر کی آواز سینما میں سنائی دیتی ہے پھر کیا تھا سارا شہر امنڈ پڑا۔ کیا بچہ کیا جوان اور بوڑھا سب ہی بڑے اچنبھے کے ساتھ فلم دیکھنے آتے اور سارے خاموش فلم میں ایک بندوق کی آواز سن کر محو حیرت ہوکر سینما ہال سے نکلتے۔ اسی طرح مالک سینما نے ہر شو میں اپنے چوکیدار سے فائر کرانے کا سلسلہ شروع کردیا۔ جسکے نتیجہ میں فلم "وہ چلی" وہ چلی کہ مالک سینما کے وارے نیارے ہوگئے اور اسی فلم کی آمدنی سے اس نے "راجیشور ٹاکیز" نامی ایک شاندار سینما ہال تعمیر کروالیا۔ مندرجہ بالا واقعہ سے آپ پر ظاہر ہوگیا ہوگا کہ خاموش فلموں کے زمانے میں ایک ذراسی آواز کی کیا اہمیت تھی۔ اسی زمانے میں "ٹیز کارپوریشن لمیٹڈ" ہالی ووڈ کا ایک اشتہار مقامی ملک کے اخباروں میں بتوسط۔ ایل مستری اینڈ کمپنی، بمبئی شائع ہوا (یاد رہے کہ اس وقت صرف بمبئی میں یہی ایک کمپنی تھی جو سارے ملک میں سینما اور فلم سے متعلق مشینری فراہم کرتی تھی) جس سے ظاہر تھا کہ "ٹیز ساؤنڈ سسٹم" اب درآمد ہوچکا تھا۔ اور اب یہ ممکن تھا کہ "بولتی فلمیں بنائی جائیں۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد دوسرا اعلان ہوا کہ اب اس برصغیر میں پہلی بولتی فلم "عالم آرا" ٹیز ساؤنڈ [illegible] پر تیار ہورہی ہے یہ ساؤنڈ سسٹم اس زمانے میں "بیل اینڈ ہاول" اور "مچل" ان ہی دو کیمروں پر رائج ہوا۔ اور پہلی بولتی فلم "عالم آرا" کی فلمبندی شروع کیگئی۔

(باقی باقی)

بقیہ:۔ تمغے

الٹ پلٹ کرکے دیکھا کرتا جس سے اسکو بہت سکون ملتا لیکن کبھی کبھی نہ جانے یہ خیال اسے کہاں سے آجاتا کہ یہ چیزیں اسے صرف اپنی زندگی کے بیس برسوں کی قیمت پر ہی حاصل نہیں ہوئی ہیں بلکہ اور بہت سی زندگیاں بھی ان تمغوں اور کاغذات کی بھینٹ چڑھ گئی ہیں اس خیال کے آتے ہی وہ بلبلا اٹھتا اور جلدی سے بکس بند کرکے باہر نکل جاتا۔ اور اگر کوئی کام نہ ہوتا تو بالٹی میں پانی بھر کے ٹھیلے کی صفائی شروع کردیتا تب وہ سوچتا کہ اب وہ واقعی بوڑھا ہوچلا ہے جبھی تو اتنی کمزوری کی باتیں سوچتا ہے ورنہ کسی محاذ پر تو اسے یہ باتیں یاد نہیں آئی تھیں۔

حسن خاں کو ٹھیلہ چلاتے ہوئے کافی عرصہ ہوگیا اس طرح اسکی آمدنی میں کچھ اضافہ بھی ہوا لیکن جمیل کے اسکول میں داخل ہونے سے کمی بھی ہوتی کیونکہ اب جمیل نے چھولے بیچنا چھوڑ دیئے تھے۔ اس دوران میں اس نے اتنی ترقی کرلی کہ خاکی رنگ کی پتلون کو گھٹنوں کے اوپر سے کاٹ کر جانگیہ بنا دیا گیا جکو وہ ہمیشہ ہاف پینٹ کہتا اور قمیض نے پہلے تو بغیر آستینوں کے شلوکے کی شکل اختیار کی اور بعد کو وہ بھی اتر گیا اور صرف بارہ چودہ آنے والا بنیان ہی رہ گیا۔

ایک رات تو بقول اس کے ساتھیوں کے بالکل بیڑہ ہوگیا جس مکان میں وہ رہتا تھا۔ اس کے برآمدے کی چھت بیٹھ گئی جسکے نیچے وہ ٹھیلہ کھڑا کیا کرتا تھا۔ حالانکہ مکان بظاہر کمزور نہیں تھا صرف دس بارہ سال سے مرمت نہیں ہوئی تھی۔ چھت کے گرنے سے ٹھیلہ مع سامان بالکل چکنا چور ہوگیا حسن خاں اس حادثہ سے حواس باختہ ہوگیا اور چند ہی دنوں میں بالکل بوڑھا ہوگیا اب اس نے بانس کے ٹکڑے پر دو تین آڑی ترچھی لکڑیاں لگاکر گڑ سے بنی ہوئی رنگ برنگی پٹی بیچنا شروع کردی جسمیں تھوڑا سا پیپر منٹ کا ذائقہ بھی ہوتا۔ وہ اس پٹی سے مختلف کھلونے بناتا اور بچوں کو بہلاتا مگر وہ اس کام سے مطمئن نہیں تھا اور ہمیشہ سوچتا کہ کہیں سے کچھ پیسے مل جائیں تو کوئی خوانچہ ہی لگالے لیکن اب تو پنشن کے بقایاجات بھی نہیں تھے جو مل جاتے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ اب اسکے بکس میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسکو فروخت کرکے تھوڑی سی رقم بھی حاصل کرسکے۔ لیکن وہ ہر مرتبہ بکس کھولتا اور چیزیں الٹ پلٹ کرتا اور ہر مرتبہ اسکی نظریں تمغوں پر ہی آن کر ٹھہر جاتیں ٭

لوگ کہتے ہیں



بھوپال

بھائی ۔ سلام و خلوص

آپ کی مستقل مزاجی اور برداشت کی داد دیتا ہوں کہ ایک سال تک منشور برابر بھیجتے رہے اور کبھی آنا بھی شکوہ نہیں کیا کہ "خط نہ بھیجا رسید کا" کچھ دن ہوئے جب سالنامہ ملا ۔ کتنے ڈھیر سے اچھے لکھنے والے آپ نے جمع کر لئے ہیں ۔ مبارک ہو ۔ واقعی سالنامہ اچھے ناموں کا ہی گلدستہ نہیں ہے بلکہ انھوں نے اپنے "کام" سے "اپنے نام" کی لاج رکھ لی ہے ۔ جوش ۔ فراق ۔ احتشام حسین ۔ عصمت کرشن چندر ۔ فیض ۔ عادل رشید ۔ ممتاز حسین ۔ وزیر آغا سردار ۔ سلام ۔ کوئی کہاں تک نام گنائے سب ہی تو موجود ہیں ۔

سچ بات تو یہ ہے کہ آپ لوگ خوب پرچہ نکالتے ہیں "حسن صورت اور حسن سیرت" دونوں کے لحاظ سے منشور کے اس سالنامے کا جواب نہیں ۔

ایک بار پھر مبارکباد قبول کیجئے ۔

(آفاق احمد)

علی گڈھ

محبی تسلیم

"منشور" کا سالنامہ ملا ۔ آپ نے جس محنت سے مضامین نظم و نثر فراہم کئے ہیں اسکی داد دینی پڑتی ہے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پرچہ میں یکسانیت نہیں بلکہ تنوع اور رنگا رنگی ہے ۔

(خلیل الرحمٰن اعظمی)

ڈھاکہ

تسلیمات

کل اچانک ایک صاحب کے ہاتھ میں ماہنامہ "منشور" کا ایک پرانا رسالہ نظر آیا ۔ پہلی ہی نظر میں میں اس کے حسن و دلکشی میں گم ہو گیا ۔ ان سے لے کر دیکھا ۔ سرسری طور پر پڑھا اور یقین جانئے بے اختیار "واہ" نکل پڑا ۔ حیرت تو اس بات پر ہوئی کہ ڈھاکہ جیسے شہر میں جہاں اردو جاننے والوں کا ایک وسیع حلقہ آباد ہے اتنا اچھا اتنا پیارا اور اتنا معیاری رسالہ کا پتہ نہیں تھا ۔ کیا آپ کے خیال میں ڈھاکہ صرف بنگالی جاننے والوں کا شہر ہے ؟؟

اختر پیامی صاحب کے ہاں سے "منشور" کا سالنامہ دیکھنے میں آیا ۔ رسالے کا سائز واقعی اب ماہنامے جیسا لگتا ہے ۔ حسن و جاذبیت میں اور اضافہ پایا اور پھر قیمت صرف سو پیسے ۔ واقعی آپکی محنت اور آپ کا خلوص قابل ستائش ہے

"کم خرچ بالانشیں" کی یہ مثال آپ پر اور آپ کے "منشور" پر بالکل صادق آتی ہے ۔

(حسن جعفری)

کراچی

مکرمی تسلیم

منشور کا فروری ۶۵ء کا شمارہ پڑھا ۔ بہت خوب خاصکر "اداریہ" اور سرورق پر جناب حبیب جالب صاحب کے اشعار کے بارے میں یہ بات قطعی حق بجانب ہو گی کہ ایسی طرز فکر بے باکی اور جرأت مندی کو جسقدر بھی سراہا جائے کم ہے ۔ خدا آپ کے پاکیزہ اور جواں عزائم کو سلامت رکھے اور آپ کی کوششیں بار آور کرے ۔ واقعی آپ جس خلوص اور جانفشانی سے کام کر رہے ہیں ۔ اس سے بڑی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں ۔

(اختر امین بجنوری)

کراچی

۔ اتن

سالنامے نے کافی مرعوب کیا ۔ یہ سوچ کر کتنی، خوشی ہوتی ہے کہ اس پرچے کا نام میں نے رکھا تھا اور اس کے مدیر اور نگراں تم اور تمہارے ساتھی ہو ۔ اگر اس دور کی ادبی اور فکری سرگرمیوں کا کوئی مبصر صرف منشور پڑھ کر کوئی فیصلہ صادر کرے تو میرے خیال میں یہ فیصلہ بڑا گمراہ کن ہو گا ۔ منشور دیکھ کر بڑی خوش فہمی ہو جاتی ہے ۔ مگر تم ہی بتاؤ کیا ہمارے ادبی سماج کی اصل صورت حال یہی ہے کیا شق سخن کے بازار میں احساس و شعور کی جنس اتنی ہی عام ہے ۔ میرے خیال میں منشور اس دور کی ادبی خوش فہمیوں کا ہرگز نمائندہ نہیں ہے یہ دور جس کا ادبی مزاج ذہن کی آبرو باختگی اور فکر کی عصمت فروشی سے عبارت ہے بس مناسب یہی ہے کہ منشور کو ایک حادثہ قرار دیا جائے ۔

(جون ایلیا)

ٹنڈو محمد خاں

بھیا سبط اختر!

منشور پڑھتا رہا ہوں ۔ ہماری مبارکباد قبول فرمائیں ۔ ہمارے خیال میں منشور ایک اعلیٰ ادبی رسالہ ہے کیونکہ اس کی بنیاد صحت مند قدروں پہ ہے آپ کا رسالہ بلاشک ادبی جمہوریت کی عظیم بنیاد رکھ رہا ہے اور اس بنا پر دوسرے رسالوں سے ممتاز بھی ۔ اردو ادب کے لئے یہ ایک نیک فال ہے ۔ اس وقت میرے سامنے جنوری کا سالنامہ ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ آپ نے کس قدر خوش ذوقی سے نئے اور پرانے لکھنے والوں کو اس گلدستہ میں آراستہ کیا ہے ۔ ممکن ہے میں منشور کو اس لئے پسند کرتا ہوں کہ خود میں بھی ادب میں جمہوریت کا قائل ہوں اور یہ بات جب میں نے آپ میں دیکھی تو ؎

"میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

خدا کرے آپ "ادب میں جمہوریت" کی روایت قائم کریں اور آگے بڑھائیں ۔

(آذر حفیظ احمد)

ٹنڈو محمد خاں

مکرمی! تسلیم

"منشور کا سالنامہ نظر سے گذرا ۔ بہت پسند آیا ۔

اتنے اچھے سالنامے کے نکالنے پر دلی مبارکباد قبول فرمائیں ۔

(واحد بیگ چغتائی)

الہ آباد

عزیزم! دعا و سلام

منشور کا سالنامہ دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی نظم و نثر کے کیسے اچھے اچھے نمونے یکجا کئے ہیں اور کس سلیقہ سے ترتیب دیئے گئے ہیں ۔ اتنا خوبصورت سالنامہ نکالنے پر میری طرف سے مبارکباد قبول کرو ۔

(احتشام حسین)

دہلی

آپ کا خط ملا ۔ اور منشور کا سالنامہ ملا ۔ شکریہ ۔ آپ نے جس محنت سے یہ خاص نمبر نکالا ہے وہ واقعی قابل تحسین ہے اگر پرچہ کا سائز بھی یہی رہے تو میرے خیال میں بہتر ہے

(دیوندر اسر)

REGD.NO. S - 2575

THE MONTHLY MANSHOOR KARACHI



